سرگذشت ٹالسٹائی

بچپن، لڑکپن اور جوانی

از

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ سنز تاجرانِ کُتب

لاہور

قیمت عہ　　　　　　　　　　　　طبع دوئم

باہتمام سوم پرکاش ساہنی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے چھپ کر
لوہاری دروازہ لاہور سے
شائع ہوئی

نذر

اُردو داں پبلک کامریڈ سوم پرکاش کے احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ کہ ان کی ترغیب ٹالشائی کی نادر تصنیف Childhood Boyhood and Youth کے ترجمہ کا باعث ہوئی۔

اصل کتاب کافی ضخیم تھی لیکن صاحب موصوف کی اِس فرمائش سے کہ حجم نہ بڑھنے پائے۔ میں اکثر ابواب کی تلخیص پر مجبور ہوا ہوں۔ تاہم حتی الوسع کوشش کی ہے کہ تسلسل و روانی میں فرق نہ آنے پائے اور باوجود اختصار کے وہی جاذبیت قائم ہے جس کی ضرورت ہے۔

کیونکہ اِس ضمن میں کامریڈ موصوف کی خوش مذاقانہ فرمائش کو خاص دخل ہے۔ لہٰذا میں اپنی اور ادبی دُنیا کی طرف سے اظہارِ تشکر و امتنان کے طور پر اسے کامریڈ سوم پرکاش جی کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

مُترجّم

دیباچہ

روس کے سحر نگار اہل قلم ٹالسٹائی نے جہاں غیر معمولی قوت جسمانی پائی تھی۔ وہاں حیرت انگیز دماغی کرشموں کا بھی مالک تھا۔ اس کی متضاد فطرت خود پر اسرار اسباق کا نتیجہ خیز نمونہ ہے۔ لڑکپن میں ایک بار آپ یہ آزمانے کے لئے کہ کیا پرندوں کی طرح میں بھی پرواز کر سکتا ہوں۔ کھڑکی سے نیچے کود پڑے۔ جوانی کے زمانے میں اپنی قوت ارادی کی آزمائش کی غرض سے کئی منٹ تک اپنی انگلی کو جلتی ہوئی شمع میں رکھے رہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس کی تصانیف و شغف علمی کا بھی یہی حال ہے۔ یونانی زبان سے نا مکمل واقفیت کے باوجود دس بارہ مستند کتابوں کی مدد سے توراۃ و انجیل کا ترجمہ کرنے کیلئے طیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچکر اسے ڈچ زبان سیکھنے کا شوق چرایا تھا۔

یہ شخص کاشتکاری کھیل کود، سیر و شکار، معلمی اپنے خاندان کی سرداری سے مفتخر ایک مذہبی فرقہ کا بانی اور تمام روسی معاصرین میں بڑا مصنف گذرا ہے۔

مترجم

ہمارا اتالیق کارل اِیوانائچ

میری دسویں سالگرہ کے تین روز بعد یعنی ۱۲ اگست ۱۸۱۸ء کو صبح سات بجے کارل ایوانائچ نے ایک چھڑی سے بندھے ہوئے نیلے کاغذ سے میرے منہ کی مکھیاں اڑا کر مجھے بیدار کر دیا۔ کارل نے کچھ ایسے بھدے انداز سے یہ کام کیا۔ کہ میرے مربی و محسن دیوتا کی تصویر جو پلنگ کے بالکل اوپر لٹک رہی تھی۔ اپنی جگہ سے ہل کر جھولنے لگی۔ میں نے بستر سے سر باہر نکالا تصویر کو درست کیا۔ اور غضب آلود آنکھوں سے جن میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا۔ کارل کو گھورنے لگا۔ لیکن اس نے اِس کی ذرا پروا نہ کی۔ اور نرم چمڑے کا بوٹ اور عمدہ لباس پہنے ہوئے کمرے میں ٹہل ٹہل کر مکھیاں مارتا رہا۔

مَیں نے خیال کیا۔ "مانا کہ میں ننھا سا بچہ ہوں لیکن میرے آرام

میں کوئی خلل کیوں ڈالے۔ وہ ویلوریا کے بستر کی مکھیاں کیوں نہیں مارتا
وہاں تو یہاں سے بہت زیادہ ہیں۔ لیکن بھلا وہاں وہ ایسا کیوں کرنے
لگا۔ ویلوریا مجھ سے عمر میں بڑا ہے۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اس لئے
وہ مجھے ہی دق کر رہا ہے۔ اس کو ہر وقت مجھے تنگ کرنے کے حیلے سوچنے
کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ اسی نے میری نیند
حرام کی اور مجھے خوف زدہ کر دیا ہے۔ لیکن وہ اتنی لاپرواہی ظاہر کر رہا
ہے۔ گویا وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے
بھی اور اس کے لباس سے بھی۔"

میں ابھی ہی جی میں کارل کو کوس رہا تھا۔ کہ وہ اپنے پلنگ پر جا بیٹھا
پلنگ کے اوپر لٹکتی ہوئی گھڑی سے وقت دیکھا۔ کاغذوالی چھڑی کو
ایک کھونٹی پر لٹکا دیا۔ اور بظاہر خوش خوش ہم سے مخاطب ہوا۔
اس نے جرمنی زبان میں نہایت ملائم لہجہ میں کہا "بچو! اٹھو....
...... وقت ہو چکا ہے۔ اماں جان کھانے کے کمرے میں جا چکی ہیں"
پھر وہ میری پائنتی آکر بیٹھ گیا۔ اور اس نے اپنی نسوار کی ڈبیہ جیب سے
نکالی۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں سو رہا ہوں۔ کارل ایوانا ئچ نے نسوار
چڑھائی۔ ناک صاف کی۔ اور پھر میری طرف راغب ہوا۔ اور میرے
پاؤں کی ایڑیوں کو گدگدانے لگا۔

اُس نے کہا۔ "آرام طلب بچو! اب تو جاگو۔"

مَیں اس کے گدگدانے سے نہ تو بستر سے اُٹھا اور نہ ہنسا بلکہ میں نے اپنے سر کو تکیئے کے نیچے سرکا لیا۔ اور اپنی ہنسی کو بالکل ضبط کر لیا۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ یہ کس قدر شفیق آدمی ہے۔ میں نے ناحق اِس کے متعلق ایسا خیال قایم کیا۔

اِس عرصہ میں میری نسیں زیر و زبر ہو چکی تھیں۔ اور اُس گدگدی سے میں تنگ آگیا تھا۔ مَیں نے چلّاتے ہُوئے اپنا سر فوراً باہر نکال لیا اور کہا۔ "کارل اِیوانا ئچ مجھے اکیلا ہی پڑا رہنے دو۔" اُس وقت میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ کارل ایوانائچ نے میرے تلوؤں سے ہاتھ ہٹا لیئے۔ اور متفکرانہ انداز میں دریافت کرنے لگا۔ کہ "کیا تمہیں کوئی بُرا سا خواب دکھائی دیا ہے؟"

اِس شفیق جرمن کے چہرے کے اِس انداز نے جس سے اُس نے میرے رونے کا سبب دریافت کیا تھا۔ یہ اثر کیا۔ کہ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ اور بالکل نہ سمجھ سکا۔ کہ میں ایک لمحہ پیشتر کیونکر اس سے نفرت کرنے لگ گیا تھا۔ اور اِس کا لباس تک مجھے کیوں بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اب مجھے وہ بالکل خوشنما معلوم ہونے لگا تھا۔ میں نے بیان کیا کہ "میں نے ایک نہایت وحشت ناک خواب دیکھا ہے ——

میری امّاں جان فوت ہوگئی ہیں۔ اور انہیں دفن کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ خود گھڑا تھا۔ میں نے اِس رات کوئی خواب نہیں دیکھا۔ مگر کارل ایوانا ئچ نے جب یہ سُنا تو اُس کے دل پہ بہت اثر ہوا۔ اور اُس نے مجھے تسلّی دینا شروع کی۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور جرابیں پہننے لگا۔ اُس وقت میری آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ اور میرے من گھڑت خواب کے دُھندلے سے خیال نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ اتنے میں ہمارا نوکر نکلوس داخل ہوا اور مجھے اِس کی موجودگی میں روتے ہوئے شرم آنے لگی۔ والود یا سامنے بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ یکایک پڑھنے کے کمرے سے کارل ایوانا ئچ کی آواز آئی۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔

اس کی آواز کرخت تھی اور اب وہ پُرشفقت لہجہ باقی نہ رہا تھا۔ جس نے اُتنا رُلایا تھا۔ وہ سکول کے کمرے میں پہنچ کر بالکل بدل چکا تھا۔ وہاں وہ ایک اُستاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی مُنہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن لئے۔ اور اس کے حکم کی تعمیل کی۔

کارل ایوانا ئچ حسبِ معمول آنکھوں پر چشمہ لگائے اور ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے دروازہ اور کھڑکی کے درمیان بیٹھا تھا۔ دروازہ کی بائیں جانب دو الماریاں تھیں۔ اِن میں سے ایک ہماری ——— بچّوں کی ———

الماری تھی۔ اور دوسری کارل ایوانایچ کی اپنی ہماری الماری میں ہر طرح کی کتابیں تھیں کچھ چھوٹی۔ کچھ بڑی اور کچھ چوڑی بعض صرف جلدیں تھیں جن کی کتابیں ندارد اور بعض کتابیں تھیں۔ جن کی جلدیں غائب اس کی لائبریری (کارل ایوانایچ اسے لائبریری کہا کرتا تھا) کی کتابیں ہم سے مختلف تھیں۔ ان میں سے ایک آدھ تو مجھے اب بھی یاد ہے۔ ایک جرمنی زبان کا رسالہ گوبھی بونے کے بیان میں۔ ایک جلد "تاریخ ہفت سالہ جنگ" اس پر چمڑے کی جلد تھی۔ جس کا ایک کونہ جلا ہوا تھا۔ کارل ایوانایچ ہر وقت مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اسی وجہ سے خراب ہو گئی تھیں۔ مگر وہ ان کے سوا اور کسی کا مطالعہ نہ کرتا تھا۔

اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے اس کی شکل پھر رہی ہے اس نے وہی لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔ اور وہی سرخ ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ میں کتاب ہے۔ اور دوسرا ہاتھ کرسی کے بازو پر رکھا ہوا ہے۔ ایک گھڑی۔ نسوار کی وہ گول ڈبیاں ایک رومال اس کے سامنے ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ترتیب اور سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کارل ایوانایچ کا ضمیر کیسا صاف اور اس کی روح کس قدر

مطمئن ہے۔

جب کوئی ناؤ کے کمرہ سے پڑھنے کے کمرہ میں داخل ہوتا تو دیکھتا کہ کارل الوانانچ کرسی پر بیٹھے اپنی ان پسندیدہ کتابوں میں سے کسی ایک کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ اُن کے چہرے سے رعب و داب ٹپکتا کمرے میں بالکل سناٹا ہوتا اُن کی سانس یا گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

بعض اوقات اُسے میرے اندر آنے کی بالکل خبر نہ ہوتی۔ اور میں دروازہ کے پاس کھڑا اِس کی اِس حالت پر افسوس کرتا۔ اور سوچتا ہم کس طرح کھیلتے کودتے ہیں۔ اور کس قدر خوش و خرم ہیں۔ مگر یہ بوڑھا بالکل اکیلا ہے۔ اور کوئی اُس کی دلداری نہیں کرتا وہ بجا کہتا ہے کہ میں یتیم ہوں۔ اِس کی وہ سرگذشت جو اُس نے نکولس کو سنائی تھی کس قدر ڈراؤنی تھی۔ اور پھر میں اس کے پاس جاتا۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا "پیارے کارل ایوانانچ" اس کو میرا یہ کہنا بہت بھلا معلوم ہوتا۔ اور وہ مجھے پیار کرنے لگ جاتا۔

دوسری دیوار پر نقشے لگے رہتے تھے۔ جو سب کے سب پھٹے ہوئے تھے۔ مگر کارل ایوانانچ نے نہایت صفائی سے انہیں درست کیا تھا۔ تیسری دیوار پر وہ رُول لٹکے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ہمارا تھا۔

جس میں جا بجا خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور دوسرا جو نیا تھا۔ وہ کارل ایوانیچ کا تھا۔ اور جسے سطریں کھینچنے سے زیادہ سزا کے لئے استعمال کرتا تھا۔ بائیں طرف ایک کونہ تھا۔ جہاں ہمارے کان پکڑوائے جاتے تھے یہاں اتنے عرصہ تک کان پکڑوائے جاتے کہ پیٹھ اور پنڈلیوں میں درد ہونے لگ جاتا تھا۔ اور خیال گذرنے لگتا کہ وہ ہمیں فراموش کر چکا ہے۔

کمرے کے درمیان میں ایک میز رکھی تھی۔ جس پہ ایک پھٹا ہوا کپڑا پڑا تھا۔ اور اس میں سے جا بجا میز کے کونے نظر آتے تھے۔ جن پر چاقو کی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میز کے گرد تپائیاں پڑی تھیں۔ جن پر کوئی رنگ تو نہیں کیا گیا تھا لیکن مدتوں کے استعمال نے اُن پر روغن چڑھا دیا تھا۔

آخری دیوار میں تین کھڑکیاں تھیں۔ اور ان میں سے یہ منظر دکھائی دیتا تھا۔ سامنے ایک سڑک تھی جس کا ایک ایک کنکر ایک ایک سوراخ اور ایک ایک گڑھا مجھے عزیز تھا۔ سڑک کے دو رویہ درخت کھڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے جہاں تہاں جھاڑیوں کی باڑیں دکھائی دیتی تھیں۔ دو رویہ درختوں سے گذر کر ایک چراگاہ تھی۔ اور اس کے سامنے ایک جنگل دُور جنگل میں چوکیدار کا جھونپڑا دکھائی دیتا تھا۔ بعض اوقات جب کارل ایوانیچ ہماری عبارت کی غلطیاں

درست کرتا ہوتا میں سامنے برآمدے سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ تو میں اِس خیال میں کھو جاتا ۔ کہ جب میں جوان ہوں گا ۔ تو میں بھی اسی طرح ان لوگوں میں مل کر بیٹھونگا ۔ جن سے مجھے اُلفت ہے ۔ اور مجھے معلوم بھی نہ ہوتا ۔ کہ کارل ایوانا پچ ہماری غلطیوں پر خفا ہو رہا ہے

اَمّاں جان

اَمّاں جان پہلے ہی سے کھانے کے کمرے میں پہنچ چکی تھیں ۔ ایک ہاتھ میں پیالی اور ایک ہاتھ میں سماوار لیئے ہوئے برتن میں چائے انڈھیل رہی تھیں ۔ مگر چائے پیالی کی بجائے پرچ میں گر رہی تھی ۔ انہیں اِس کی کچھ خبر ہی نہ تھی ۔ اور نہ ہی ہمارے اندر داخل ہونے کا اُنہیں کچھ علم ہُوا ۔

جب کبھی اپنے عزیز کا تصوّر کیا جاتا ہے ۔ تو کئی چیزوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ اِس کی شکل صورت کا ایک دُھندلا سا خاکہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ مگر اصلی چہرہ نظر نہیں آتا ۔ اِسی طرح جب میں اپنی والدہ کا تصوّر کرتا ہوں تو میرے سامنے اِن کی تصویر کھنچ جاتی ہے ۔ جو اُسی طرح مہربانی اور اُلفت کا اظہار کرتی ہے ۔ اور

اس کے نازک اور پتلے ہاتھ دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے مجھے کئی دفعہ پیار کیا۔ اور میں نے کئی دفعہ انہیں بوسہ دیا۔ مگر اصل شکل مجھ سے چھپی رہتی ہے۔

صوفا کی بائیں جانب ایک پرانی وضع کا بڑا سا پیانو رکھا تھا۔ جسے میری ہمشیرہ لیوبا بجا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی باربارا ایوانونا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ سے غم و غصہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور جونہی کارل ایوانا یچ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اور بھی تمتما اٹھا۔ اس نے غصہ سے کارل کی طرف دیکھا اور کہنا شروع کیا۔ کارل ایوانئچ میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

کارل ایوانا یچ نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور حسبِ معمول میری والدہ کی طرف بڑھا۔ اور اس کے ہاتھ کو پکڑا۔ اس وقت اس نے چونک کر سر کھجلایا۔ گویا وہ ان افسردہ خیالات کو دور کر رہی ہے۔

میری والدہ نے اس سے دریافت کیا۔ "کیا بچے آرام کر چکے؟"

چونکہ کارل ایوانئچ ایک کان سے بہرہ تھا۔ اور پیانو کی آواز بھی گونج رہی تھی۔ اس لئے اس نے کچھ نہ سنا۔ میری والدہ نے پھر دریافت کیا۔ "کیا بچے جاگ اٹھے؟" مگر اس دفعہ بھی وہ کچھ نہ سن سکا اور مسکرا دیا میری والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بچی ذرا دم لے۔ کچھ

سنائی ہی نہیں دیتا۔"

جب میری والدہ مسکراتی تھیں۔ توان کا خوبصورت چہرہ حیرت انگیز طور پر بہت پیارا ہو جاتا۔ اور یہ معلوم ہوتا۔ کہ اس سے گردوپیش کی چیزیں چمک اٹھتی ہیں۔ اگر میں زندگی کے نہایت افسردہ لمحات میں اِس مسکراہٹ کی ایک جھلک دیکھ پاؤں۔ تو مجھے معلوم بھی نہ ہو کہ افسردگی کہتے کسے ہیں۔ میرے خیال میں چہرے کی خوبصورتی تبسم پر منحصر ہے۔ اگر تبسم چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ کرے تو چہرہ خوبصورت ہے۔ اگر اس سے کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ تو وہ چہرہ ایک معمولی چہرہ ہے اور اگر وہ تبسم سے مسخ ہو جائے۔ تو بدصورت چہرہ ہے۔

جب میری والدہ نے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ تو اس کی نگاہ میرے چہرہ پر پڑی۔ اور اس نے کہا: "کیا تم رو رہے تھے؟" اور میری آنکھوں کو بوسہ دیا۔ اور جرمنی زبان میں پوچھا "تمہارے رونے کی وجہ کیا تھی؟"

میں نے جواب دیا: "اماں جان میں خواب میں ہڑبڑا اٹھا تھا۔"

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اور ہمیں ابّا جان کے کمرے میں جانے کا حکم ملا۔ جب پھر وہاں گئے۔ تو ہمیں معلوم ہوا۔ کہ ہم کو ماسکو جانے کی تیاریاں کرنا ہیں۔

تعلیم

کارل ایوانائچ کی تیوڑی اور حرکات سے پتہ چلتا تھا۔ کہ اس کی طبیعت کا توازن غائب ہے۔ اُس نے اس مکالمہ پر جسے میں زبانی یاد کرتا تھا۔ ناخن سے نشان کر دیا۔ والودیا نے اچھی طرح پڑھا۔ مگر میری طبیعت کچھ ایسی بگڑی ہوئی تھی۔ کہ مجھ سے کچھ کام نہ ہو سکا۔ کچھ دیر تک میں بالکل بیہوش سا کھڑا رہا۔ اور ایک حرف بھی مجھ سے نہ پڑھا گیا کیونکہ آئندہ جدائی کے خیال سے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ جب سبق سنانے کا وقت آیا۔ اور میں اس مقام پر پہنچا۔ جہاں ایک سوال کرتا ہے۔ کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ اور اس کے جواب میں دوسرا کہتا ہے کہ میں چائے خانے سے آیا ہوں۔ تو میری آنکھوں سے آنسو بھر آئے۔ اور اس سے آگے کا یہ فقرہ میری زبان سے بالکل نہ ادا ہو سکا۔ "کیا تم نے اخبار نہیں پڑھا ہے؟ جب لکھنے کا وقت آیا تو میرے آنسوؤں کے گرنے سے حرفوں پر اس طرح دھبے پڑ گئے تھے۔ گویا میں نے سیاہی چوٹ پر پانی سے لکھا ہے۔

کارل ایوانائچ مجھ سے خفا ہو گئے۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا۔ کہ

تم گستاخ ہو۔ پھر مجھے دھمکا کر کہا۔ مجھ سے معافی مانگو مگر پھر شاید یہ خیال کر کے کہ وہ اِس سختی میں حق بجانب نہیں۔ اُٹھ کر نکولس کے کمرے میں چلا گیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

اُس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا "کیا تم نے سُنا ہے کہ بچّے ماسکو بھیجے جا رہے ہیں"

اُس نے جواب دیا۔ جی ہاں۔

میں کونے سے اٹھا اور اُن کی گفتگو سُننے کے لئے دروازہ کے قریب چلا گیا۔

کارل ایوانا یچ نے کہا۔ خواہ کس قدر کسی سے بھلائی کی جائے اور اِس سے باہم مِل جُل کر رہا جائے کسی سے احسانمندی کی توقع نہیں ہو سکتی۔

نکولس نے سر کی جنبش سے اِس کی تصدیق کی۔

کارل ایوانا یچ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ میں بارہ سال سے اِن کے یہاں رہتا ہوں۔ اور خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں اولاد سے بھی بڑھ کر اِن سے محبت اور ان کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ اب کہ وہ سیانے ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ بہتر طریقے پر پڑھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ گویا وہ یہاں پڑھ ہی نہیں رہے تھے۔

نکولس نے جواب دیا خیال تو کیجئے۔ وہ اس سے زیادہ کیا پڑھیں گے؟

کارل ایوانچ نے جواب دیا۔ ہاں اب میری ضرورت نہیں رہی اور اب مجھے واپس بھیج دیا جائے گا۔ وہ وعدے کیا ہوئے؟ وہ احسانمندی کدھر گئی۔ میں اس کی وجہ سمجھتا ہوں۔ میں کسی کی چاپلوسی نہیں کرتا۔ وہ میرے یہاں نہ رہنے سے امیر تو بن نہ جائیں گے۔ اور خدا رحم کرے مجھے بھی پیٹ بھرنے کو کہیں نہ کہیں روٹی کا ٹکڑا مل ہی جائے گا۔

مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ مجھے اپنے والد اور کارل ایوانچ سے یکساں اُنس تھا۔ اور مجھے سخت صدمہ ہوا۔ کہ اُنہوں نے ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اور پھر کونے میں جا کر اُن کی مفاہمت کے طریقہ پر غور کرنے لگا۔ جب کارل ایوانچ ہمارے پڑھنے کے کمرہ میں واپس لوٹ آیا۔ تو اُس نے مجھ سے کہا "کھڑے ہو جاؤ اور زبانی عبارت لکھنے کے لئے اپنی کاپی نکال لو"

وہ شاہانہ انداز سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور یہ فقرہ لکھنا شروع کیا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی آواز بہت گہرائیوں میں آ رہی ہے۔

"دنیا میں سب سے گہرا جذبہ احسان فراموشی ہے"۔

اُس نے کاپیاں ہم سے لیں۔ اور اس فقرہ کو جو اس کے اندرونی خیالات کا آئینہ تھا بار بار پڑھا۔ گویا اُسے کچھ تسکین سی ہو رہی تھی۔ پھر

اُس نے ہمیں تاریخ کا سبق پڑھایا ۔ اور کھڑکی میں جا بیٹھا ۔ اب اس کا چہرہ پہلے کی طرح اُداس نہیں تھا ۔ اس کے چہرہ سے اس قسم کی تسکین ظاہر ہوتی تھی ۔ جو ہتک کا بدلہ لے لینے سے ظاہر ہوتی ہے ۔

ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے ۔ مگر کارل ایوانایچ ہمیں چھٹی دینے کا نام نہ لیتا تھا ۔ بھوک کے مارے ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا ۔ میں آنے جانے والوں کو غور سے دیکھتا تھا ۔ اور برتنوں کی جھنکار پر میرے کان لگے ہوئے تھے ۔ بڑے انتظار کے بعد ایک اجنبی صورت نے دروازہ کھولا ۔

سادہ لوح

ایک پچاس برس کا زرد رو آدمی جس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے اَٹ گیا تھا ۔ کمرہ میں داخل ہُوا ۔ وہ اتنا لمبا تھا ۔ کہ دروازے سے گذرتے وقت اُسے اپنا تمام جسم جھکانا پڑا ۔ وہ بے ڈھنگم طریقہ پر کھل کھلا کر ہنسا اور پکار اُٹھا ۔ پکڑ لیا ۔ پھر وہ والوویا کے پاس گیا ۔ اور اُسے پکڑ لیا ۔ غور سے دیکھنے کے بعد اُس نے اُسے چھوڑ دیا ۔ اُس کے بعد ہماری میز کے پاس آ کر اُس نے صلیب کا نشان بنایا ۔ اور

پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔افسوس ...... آپس میں پیار کرنے والی ہستیاں ...... بچھڑ جائیں گی۔اِس وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔اس نے ایسے درد بھرے الفاظ میں اس فقرے کو ادا کیا۔کہ سننے والے کے لئے ناممکن تھا۔کہ اس کے دِل میں خوف اور غم کے مِلے جُلے جذبات پیدا نہ ہوں۔

اس کا نام گرشا تھا۔یہ تو معلوم نہیں تھا۔کہ یہ شخص کون ہے۔کہاں سے آیا ہے۔اور اس کی اِس آوارہ زندگی کی محرک کیا شے ہے۔ہاں اتنا جانتا ہوں۔کہ وہ پندرہ سال کی عمر سے گرمیوں اور سردیوں میں ننگے سر اور ننگے پاؤں پھرتا رہتا تھا۔اور مقدس مقامات میں گھوما کرتا تھا۔وہ مبہم سی باتیں کرتا جنہیں لوگ پیشین گوئیاں سمجھتے تھے۔وہ اکثر ہماری دادی اماں کے یہاں آیا جایا کرتا تھا۔بعض لوگوں کا خیال تھا۔کہ وہ کسی امیر والدین کا بدنصیب بیٹا ہے۔اور بعض کہتے تھے۔کہ ایک جاہل کسان ہے۔

آخر ہمیں کھانے کے کمرے میں بلایا گیا۔ہم نے اِدھر کا رُخ کیا تو گرشا بھی ہمارے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ممی کمرے میں بیٹھی تھیں۔انہوں نے کارل ایوانا ئچ کو دیکھ کر منہ پھیر لیا جب کھانا کھانے بیٹھتے۔تو وہ اکثر مخل ہوتیں۔اور کہتیں اس کے ساتھ روٹی کھاؤ۔تم اپنا

کاش کسی طرح پکڑتے ہوئے ہمیں یہ بہت برا معلوم ہوتا۔ اور ہم دل میں کہتے کہ یہ لڑکیوں کو جا کر سکھائے۔ ہمارے لئے تو کارل ایوانچ کافی ہے۔

جب بڑے بوڑھے لوگ دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ تو کٹیلا نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ اماں جان سے کہو ہمیں شکار کھیلنے لے چلیں۔

میں نے اسے جواب دیا "بہت اچھا کوشش کریں گے"۔

گرشا علیحدہ میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ عجیب عجیب شکلیں بناتا۔ اور اپنے آپ سے کہتا۔ افسوس فاختہ اڑ گئی . . . . قبر پر پتھر رہ گیا۔

اسی دوران میں میری والدہ اور والد آپس میں بحث کرنے لگے۔ میری والدہ کہتی تھیں۔ کہ یہ بزرگ آدمی ہے۔ اور والد اس بات پر زور دیتے تھے۔ کہ یہ سست لوگ ہیں۔ اور مجھے حیرانی ہے۔ کہ پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شکار کی طیاریاں

اباجان نے جیکب کو بھیجا۔ کہ جا کر گھبّی۔ گھوڑے اور کتے شکار کیلئے تیار کرائے۔ اور ہم باغ میں کودنے پھاندنے چلے گئے۔ باغ سے جب ہم نے دیکھا۔ کہ گھوڑوں پر زین کسے جا رہے ہیں۔ گھوڑے جُت رہے ہیں۔ تو ہم کپڑے پہننے کے لئے اوپر دوڑ گئے۔ اور اس طرح کے کپڑے پہننے میں مشغول ہوئے۔ جن سے کہ پورے شکاری نظر آئیں۔ ہماری اماں جان شکار کا لفظ سنتے ہی بہت ڈریں۔ والد نے بہت سمجھایا۔ اور والودیا نے بھی کہا۔ کہ جب گھوڑا بدکتا ہے۔ تو مجھے بہت لطف آتا ہے مگر انہوں نے جواب دیا۔ کہ جب تک تم باہر رہو گے میں سخت بیقرار رہوں گی۔

اس دن گرمی زیادہ تھی۔ افق پہ صبح سے بادل نمودار ہو رہے تھے اور گرم ہوا کے جھونکے انہیں ایک دوسرے کے نزدیک تر لاتے جا رہے تھے بعض اوقات وہ سورج کے اوپر چھا جاتے تھے شام کے قریب وہ بکھرنے شروع ہو گئے۔ کچھ زرد پڑ گئے۔ کچھ افق کی طرف دوڑ گئے۔ کچھ سر کے اوپر چمکنے لگے۔ اور ابر کا ایک بڑا سا ٹکڑا مشرق

کی طرف چھایا رہا کارل اپوانا بچ موسم کے تغیرات دیکھ لیتا تھا۔ اس نے
کہدیا۔ کہ آج بارش نہیں ہوگی۔ اور موسم صاف رہے گا۔
جب سامان تیار ہوگیا۔ کچھ لوگ بگھی میں بیٹھ گئے۔ اور ہم گھوڑوں پر
سوار ہو گئے۔ سوالودیا گھوڑے پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس پر
رشک آتا تھا۔ میں نے اپنے سائے سے اندازہ لگایا۔ کہ میں سمجھتا نہیں۔
اتنے میں اباجان کے پاؤں کی آواز آئی۔ سب ہوشیار ہوگئے۔ نوکروں
نے سامان سفر درست کر رکھا تھا۔ وہ آتے ہی گھوڑے پر سوار ہوئے
اور ہم روانہ ہو گئے۔

شکار

ایک شکاری جس کا نام نوکا تھا۔ ہمارے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کے
سر پر ایک پھٹی ہوئی ٹوپی تھی۔ کندھوں پر ایک سینگ تھا۔ در پیٹی
میں شکاری چاقو۔ اس کا چہرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مرنے مارنے
پر تیار ہے۔ ابا نے ہمیں اور شکاری کو سڑک پر چلنے کا حکم دیا۔ اور خود
کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے۔
فصل بالکل پک چکی تھی۔ کھیت سنہری ہو گئے تھے۔ اور ان کے

ایک طرف بڑا گھنا جنگل تھا جسے میں سمجھتا تھا کہ بہت دُور واقع ہے۔ اور وہ ایک پُر اسرار جگہ ہے۔ جس کے آگے یا تو دُنیا ختم ہو جاتی ہے۔ یا وہاں سے غیر آباد ملک شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ کسان فصل کاٹ چکے تھے کچھ جھک کر کاٹ رہے تھے۔ کچھ چھکڑوں پہ لاد رہے تھے۔

جب ہم جنگل میں پہنچے۔ تو ہم یہ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ کہ وہاں ایک گاڑی پہلے ہی سے موجود ہے۔ اور اس میں سماوار اور کچھ نفیس نفیس ڈبے رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے سمجھنے میں غلطی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا۔ کہ اس کھلی فضا میں چلنے کے ساتھ آئس کریم اور پھل کھائے جائیں گے ہمیں یہ سب سامان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ہمیں مناسب ہدایات مل گئیں۔ اور مختلف سمتوں کو بھیج دیا گیا۔ اور ہم سے کہا گیا۔ کہ خبردار بغیر خرگوش مارے واپس نہ لوٹنا میں شکاری کتے کو ساتھ لے کر ایک طرف جھاڑیوں میں چلا گیا اور کتے نے بھونک بھونک کر شکار کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ اتنے میں ایک تیتری نے مجھے اپنی طرف راغب کر لیا۔ اُس نے مجھ سے دو قدم کے فاصلے پہ ایک چکر کاٹا۔ اور ایک پھول پہ جا بیٹھی۔ میں اسی میں محو تھا۔ کہ کتا نہایت زور سے بھونکا۔ میں ڈر گیا اور قریب تھا کہ گر پڑتا۔ اتنے میں ایک خرگوش نے چھلانگ لگائی۔ اور سامنے سے نکل گیا۔ لڑکا جھاڑیوں کے پیچھے

سے لموار تھا ۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ واہ صاحب! مگر اس انداز سے کہ اگر آپ مجھے خرگوش کی طرح کاٹھی کے پیچھے لٹکا دیتے ۔ تو یہ مجھے اُس سے خوشگوار معلوم ہوتا ۔

کھیل کُود

شکار ختم ہو گیا ہم درختوں کے سائے میں ایک دائرہ کی شکل میں بیٹھ گئے ۔ گھنے پتوں میں کہیں کہیں سے سورج کی کرنیں جھانک رہی تھیں ۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نہایت خوشگوار معلوم ہوتے تھے ۔

جب ہم اپنے حصے کے پھل وغیرہ لے کر کھا پی چکے ۔ تو دوپہر کا کوئی کام باقی نہ رہا ۔ اور چلچلاتی دھوپ کے باوجود ہم اُٹھ کر کھیلنے کے لئے چلے گئے ۔ مختلف قسم کی کھیلوں کی تجویزیں کی گئیں مگر کسی نہ کسی طرح انہیں رد کر دیا جاتا ۔

ہم نے ایک کھیل تجویز کی ۔ والو دیا نے اس کی مخالفت کی جو اصل وہ عقلمند تو تھا ۔ مگر اُس کا تخیل بلند نہ تھا ۔ اس لئے وہ اس میں دلچسپی نہیں لے سکتا تھا ۔ اور آج تو وہ ایک شکاری کی حیثیت میں تھا ۔ اس لئے بہت زیادہ مغرور ہو گیا تھا ۔

والودیا کے اس رُوکھے پن نے ہماری دلچسپی چھین لی۔ اور اس کے
رُوکھے پھیکے چہرے نے کھیل کے لُطف کو بالکل تباہ کر دیا۔ جب ہم زمین
پر بیٹھ کر اپنے آپ کو ماہی گیر فرض کر کے مچھلیاں پکڑنے کے لئے کشتی کھینے
لگے۔ تو والودیا ایسے تصنّع سے بیٹھا۔ کہ وہ ہرگز ایک ملّاح کا طریقہ نہ تھا
میں نے اس سے اس کی اس روش پر کہا بھی۔ مگر اس نے جواب دیا۔
کہ زیادہ بازو ہلانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں مل سکتا۔ اور کم ہلانے
سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کوئی فاصلہ تو
طے نہیں کر سکیں گے۔ پھر میں اپنے آپ کو شکاری فرض کرتے ہوئے
چھڑی لے کر شکار کھیلنے کے لئے جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ اس سے
بندوق کی طرح شست باندھوں۔ والودیا نے پھر ویسی ہی حرکت
کی۔ ایسی حرکتوں سے کھیل کی خوشی پر اوس پڑ جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں
کہ چھڑی سے بندوق کی طرح نشانہ لگانا محال ہے۔ مگر یہ تو ایک کھیل
تھا۔ اور اگر انسان بالکل اصلیت کو لے تو کھیل کھیل نہیں رہتا۔

میرا باپ کس قسم کا آدمی تھا

میرے ابّا پہلے زمانے کے آدمی تھے۔ موجودہ وقت کے نوجوان ان کے اطوار بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ ہمارے زمانہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ ان کے اندرونی غرور کا نتیجہ تھا انہیں اس بات کا سخت رنج تھا۔ کہ ان کا پہلا سا وقار جو انہیں اپنے زمانے میں حاصل تھا۔ اب نہیں رہا تھا۔ تاش اور عورت ان کی زندگی کی دو بڑی خواہشیں تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپے کمائے تھے۔ اور ہر طبقہ کی عورتوں سے راہ و رسم پیدا کی تھی۔ اور ہر حیثیت کے لوگ انہیں اچھا سمجھتے تھے۔

وہ جانتے تھے۔ کہ کس طرح سب پر سبقت حاصل کی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ بہت بڑے طبقے سے نہیں تھے۔ مگر وہ ملتے ہمیشہ اسی طبقے کے لوگوں سے تھے۔ اور ہمیشہ ان سے عزت کراتے تھے۔ وہ اس حد تک غرور اور خود اعتمادی کو دخل دیتے تھے جس حد تک کہ لوگوں کو ناگوار معلوم نہ ہو۔

یہی وجہ تھی۔ کہ دنیا کی نظر میں ان کی وقعت بڑھ گئی تھی۔ دنیا کی

کوئی چیز انہیں حیرت میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ خواہ کیسی ہی شاندار حیثیت اختیار کریں یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی حالت میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے تاریک پہلو کو دوسرے سے اس طرح چھپا لیتے تھے۔ اور اس طرح اسے دور کر دیتے تھے کہ لوگوں کو ان پر رشک آتا تھا۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کے تعلقات بڑے بڑے آدمیوں سے تھے۔ کچھ تو میری والدہ کے خاندان کی وجہ سے اور کچھ ان کے اپنے دوستوں کی وجہ سے تھے۔ جو بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔ اور جن سے وہ حسد رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ خود لفٹننٹ کے عہدے سے آگے نہ بڑھے تھے۔ چنگی کے دوسرے پنشن خوار افسروں کی طرح انہیں عمدہ لباس تو پہننا نہیں آتا تھا۔ مگر اس سے ایک شان اور جدت ضرور نمایاں ہوتی تھی۔ انہیں ہر قسم کا لباس بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ بہت رقیق القلب انسان تھے۔

انہوں نے اپنی آخری عمر میں کچھ اصول بنا لئے تھے جو سراسر انکے اپنے تجربہ پر مبنی تھے۔ ان سے انہیں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اور ان کا خیال تھا۔ کہ ہر ایک آدمی کو ان پر عمل کرنا چاہیئے۔

کمرہ مطالعہ اور ڈرائینگ رُوم میں کیا ہوا

جب ہم گھر پہنچے۔ تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ اماں جان پیانو بجانے لگ گئی تھیں۔ اور ہم سب بچے کاغذ پنسل اور روغن لے کر تصویریں کھینچنے کے لیئے میز کے گرد بیٹھ گئے۔ باوجودیکہ میرے پاس صرف نیلے رنگ کا روغن تھا۔ میں نے شکار کے واقعات نقشہ کھینچنے کا ارادہ کیا۔ جب میں نہایت نمایاں طور پر نیلے رنگ کا ایک لڑکا اور ایک گھوڑا بنا چکا۔ تو مجھے شک پیدا ہوا کہ نیلے رنگ کا خرگوش ہو سکتا ہے۔ یا نہیں میں یہ دریافت کرنے کے لیئے اباجان کے کمرے میں گیا۔ اور ان سے دریافت کیا کہ کیا نیلے رنگ کے خرگوش ہوتے ہیں؟ انہوں نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔ ہاں میاں ہوتے ہیں۔ میں پھر گول میز کے گرد آبیٹھا۔ اور میں نے ایک نیلے رنگ کا خرگوش بنایا۔ مگر پھر ضروری معلوم ہوا۔ کہ ایک جھاڑی بنادی جائے۔ اس لیئے میں نے اسے جھاڑی میں تبدیل کر دیا۔ پھر مجھے جھاڑی بھی پسند نہ آئی۔ اور میں نے اسے درخت میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح میں نے کاغذ کو بالکل نیلا کر دیا۔ اور پھر جھنجلا کر اس کو پھاڑ دیا۔ سامنے کے کمرہ سے کچھ لوگ

اندر آئے۔ اور آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر کے دبے پاؤں چلے گئے پھر ایک بلند آواز سُنائی دی۔ ابا کے بعد کارل ایوانایچ نے آہستہ سے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب اُسے اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ تو دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

میں نے خیال کیا۔ خدا خیر کرے۔ کارل ایوانایچ خفا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کسی کام کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ میں اسی خیال میں تھا۔ کہ اونگھنے لگا۔

بوٹوں کی آواز سے جاگا۔ تو کارل ایوانایچ کو دیکھا کہ آنسو پونچھتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ ابا جان اماں کے پاس گئے۔ اور ان سے کہنے لگے۔ جانتی ہو۔ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟

"کیا"؟

میں کارل ایوانایچ کو بچوں کے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ وہ ان سے گھُل مِل گیا ہے۔ اور اس کی تنخواہ ہمارے لئے کوئی بڑی بات بھی نہیں اماں جان نے جواب دیا۔ میں اس سے متفق ہوں۔ یہ دونوں کے لئے اچھا ہے۔

کارل ایوانایچ کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ میں لئے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور جو بے انصافی اُس کے ساتھ کی گئی تھی۔ اُس کے متعلق

نہایت مؤثر لہجہ میں تقریر کرنے لگا۔ جب وہ اِس فقرہ پر پہنچا مجھے اِن بچوں سے جُدا ہونے کا بہت افسوس ہوگا۔ تو وہ اس قدر گھبرا گیا۔ کہ اس کی آواز کانپنے لگی جس وقت اُس نے یہ کہا: "مجھے بچوں سے بہت اُنس ہو گیا ہے۔ اور میں نہیں جانتا۔ کہ اِن کے بغیر میں کیا کروں گا میں تنخواہ کے بغیر اپنا کام سرانجام دینے کو تیار ہوں۔"

میرے اَبّا نے اس کے کندھوں پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ اگر تمہیں ہم سے علیحدہ ہونے کا افسوس ہے۔ تو مجھے تم سے بھی زیادہ رنج ہے۔ اب میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔"

کھانا کھانے سے ذرا پہلے گرشا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اور اِسی وقت سے برابر رو رہا تھا۔ اور آہیں بھر رہا تھا۔ جن لوگوں کو اس کی کرامتوں پر یقین تھا۔ اِن کا خیال تھا۔ کہ ہمارے گھر پر کوئی مُصیبت نازل ہوگی۔ آخر اس نے اجازت مانگنا شروع کی۔ اور کہا۔ کل میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

میں نے اسی وقت والودیا کو اشارہ کیا۔ اور ہم دونوں اِس کے کمرہ میں جا کر ایک کونے میں چھپ رہے۔ اور اُس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

گرشا

گرشا ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں شمع لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور ہم نے اس وقت سانس لینے کی بھی جرأت نہ کی۔

اس نے اپنے مخصوص لہجے میں حضرت عیسیٰ اور اس کی مقدس ماں حضرت مریم کے ناموں کا ورد کیا۔ پھر اس نے اپنا کوٹ اتارا اور اسے تہ کر کے کرسی پر رکھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مثل سابق جلدبازی اور پاگلوں کے سے آثار نہ تھے۔ بلکہ وہ نہایت بارعب اور دانشمند معلوم ہوتا تھا۔

وہ آہستہ سے بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف صلیب کا نشان بنایا۔ اور عبادت[1] کے طریق پر شمع کو گھمایا پھر اسے اُلٹا کر کے بجھا دیا۔

جنگل کی طرف جو دو کھڑکیاں تھیں۔ ان سے ماہ کامل کی کرنیں کمرے

---

[1] جس طرح اب ہنود سندھیا کرتے ہیں۔

کے اندر داخل ہوئیں جس سے اِس کا زرد چہرہ چمک اُٹھا۔
گرشا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی گردن کو جھکا دیا۔ اور
دُعا مانگنے میں مشغول ہو گیا۔
پہلے اُس نے آہستہ آہستہ دُعا مانگی پھر اُسے اُونچی آواز میں دُہرایا
پھر اُس نے اُن لوگوں کے لئے دُعا مانگی۔ جو اس کی خاطر مدارات کرتے
تھے۔ پھر ہماری والدہ اور ہمارے گھر کے لئے دُعا مانگی۔ اُس نے اپنے
لئے فقط یہ دُعا مانگی: "اے خدا ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ اے
خدا میرے دُشمنوں کو معاف کر دے" اور بار بار انہیں الفاظ کو دُھراتا
رہا۔
والودیا نے میری ٹانگ پر نہایت زور سے چٹکی لی۔ مگر میں نے مُڑ
کر بھی نہ دیکھا۔ میں نے اس جگہ کو ہاتھ سے مل دیا۔ اور گرشا کی حرکات اور الفاظ
کو ایک بچہ کی سی حیرانی، رحم اور ہمدردی سے دیکھتا اور سنتا رہا۔ ہنسی
اور مذاق کی بجائے جن کی مجھے کمرے میں داخل ہوتے وقت اُمید تھی،
میں کانپنے لگا۔ اور مجھے یہ معلوم ہوا۔ کہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔
گرشا دیر تک اسی مذہبی انہماک میں رہا۔ اور بار بار مگر ہر بار ایک
تازہ جوش کے ساتھ دُہراتا۔ اے خدا مجھ پر رحم کر۔ اے خدا مجھے بخش دے
اور پھر اس زور سے یہ الفاظ کہتا۔ گویا کسی سے اُس کا جواب چاہتا ہے۔

"اے خدا مجھے بتا کہ کیا کیا جائے" اس کے بعد گڑگڑا کر رویا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ اور بالکل خاموش ہو گیا۔

اوگرشا تمہارا اعتقاد اس قدر راسخ تھا۔ کہ تم نے اپنے آپ کو خدا کے قریب پایا۔ تمہیں اس سے اس قدر محبت تھی۔ کہ الفاظ خود بخود تمہارے منہ سے نکل رہے تھے .... جس وقت تمہارے پاس الفاظ نہ رہتے۔ اس وقت تم خدا کی کس قدر بلند تعریف کرتے یعنی تم زمین پر گر کر رونے لگ جاتے۔

ناٹالیا ساوشنا

ناٹاشا کو اس کے والد کی خدمات کے صلے میں میرے دادا نے اپنے گھر میں ملازم رکھ لیا تھا۔ ناٹاشا نے حسن خدمات کی وجہ سے گھر بھر میں ایک امتیازی حیثیت قائم کر لی۔ جب میری والدہ پیدا ہوئیں۔ اور ان کو ایک انا کی ضرورت پیش آئی۔ تو یہ خدمت اسے تفویض کی گئی۔ اس نے اپنی وفاداری اور کام میں دلچسپی لینے اور اسے عمدگی سے سرانجام دینے سے گھر بھر کی

رضامندی حاصل کرلی ۔ آخر ایک شخص نے جس کا نام فوکا تھا ۔ اور جسے اس کے ساتھ ملنے کے بہت سے موقعے ملتے تھے ۔ اس کے دل پر قبضہ کرلیا ۔ اس نے ہمت کر کے میرے دادا ابا کے پاس پہنچکر فوکا سے شادی کرنے کی اجازت مانگی ۔

دادا ابا نے اس کی اس حرکت کو احسان فراموشی پر محمول کیا ۔ وہ اس سے ناراض ہو گئے اور سزا کے طور پر اسے مویشی خانے میں بھیجدیا ۔ اور چھ ماہ کے بعد جب کوئی بھی اس کی جگہ کام کرنے کو نہ ملا ۔ تو اسے واپس اپنی جگہ پر رکھ لیا گیا ۔ وہ دادا ابا کے پاس گئی ۔ اور اس نے اس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگی ۔ اور قسم کھائی ۔ کہ آئندہ وہ اس خیال کو کبھی دل میں جگہ نہ دے گی اور واقعی وہ اپنے لفظوں پر قائم رہی ۔ اس وقت اسے ٹاٹا شا کی بجائے ٹاٹا لیا سا وشنا کے باعزت نام سے پکارا جانے لگا ۔ اس نے اپنی تمامتر توجہ کو گھر کی دیکھ بھال پر صرف کر دیا ۔ اور ٹوٹی پھوٹی اور ردی چیزوں کو از سرِ نو درست کیا ۔ اور اپنے فرض کو نہایت خوبی سے سرانجام دیا ۔

جب میری والدہ کی شادی ہوئی ۔ تو اس نے مناسب سمجھا کہ اسے کسی نہ کسی طرح اس کی ہمدردیوں کا صلہ دیا جائے ۔ اس لئے

اس نے اسے کمرے میں بلا کر ایک دستاویز دی جس میں اُسے آزاد کیا گیا تھا۔ اور خواہ وہ کہیں رہے۔ اُسے تین سو روپے سالانہ بطور پنشن ملا کریں گے۔ اُس نے اس دستاویز کو لے لیا۔ اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کچھ دیر کے بعد میری والدہ اُس کے پیچھے گئیں۔ اور انہوں نے دیکھا کہ وہ دُوسرے کمرے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ میری والدہ نے اُس سے پُوچھا۔ نانا ابا ساؤشا کیا معاملہ ہے؟

اِس کے جواب میں اُس نے کہا۔ کہ آپ کسی نہ کسی طرح مجھ سے ناخوش ہو گئی ہیں۔ اور مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہیں۔ اچھا میں چلی جاتی ہوں۔ وہ روتی ہوئی جانے ہی کو تھی۔ کہ میری والدہ نے اُسے پکڑ کر گلے سے لگا لیا۔ اور دونوں رونے لگ گئیں۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ میرے دل میں نانا ابا ساؤشا کی محبت اور مہربانیوں کی یاد تازہ رہتی ہے۔ مگر یہ اب احساس ہوا ہے جب میں ان کی قدر کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ اس وقت میرے دماغ میں یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ بڑھیا کتنی نادر اور نایاب ہستی تھی۔ اِس کی تمام زندگی ہماری صاحب سنبھال میں گذری کبھی کبھی میں پڑھائی سے بچنے کے لئے اس کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اور اسے ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول پاتا اور جس وقت

میں بیٹھے بیٹھے بیہودہ کہنے لگتا: "کہ جب میں جرنیل ہوں گا۔ تو ایک خوبصورت عورت سے شادی کروں گا۔ اپنے لئے شیشے کا گھر بناؤں گا۔ اور کارل ایوانا ویچ کے رشتہ داروں کو سیکسنی سے بلا بھیجوں گا۔" وہ اِن خرافات کو سنتی رہتی۔ اور کہے جاتی۔ ہاں میرے بچے ہاں۔

اِس کے صندوق میں ہر قسم کی اشیاء موجود رہتیں جس چیز کی ضرورت پڑتی۔ بلا تامل اِس سے کہا جاتا۔ اور وہ تھوڑی سی تلاش کے بعد اُسے لے آتی اور کہتی: "اچھا ہوا میں نے اسے سینت رکھا تھا۔ اس کے صندوق میں ہزاروں ایسی چیزیں محفوظ رہتی تھیں جنہیں اس کے سوا گھر کا کوئی آدمی نہ جانتا تھا۔ اور نہ اِس کی پرواہ کرتا تھا۔

جُدائی

ہم جانے کی طیاریاں کرنے لگے۔ نوکر ننگے سر اور ننگے پاؤں ہمارے گرد کھڑے ہو گئے۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی اور اُفق کا رنگ کچھ بھورا سا ہو گیا تھا۔ مگر آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا اپنے ساتھ سڑک سے بہت سا گرد و غبار اُڑا لائی تھی۔ درختوں کی شاخوں کو جھکا جاتی تھی۔ اور زرد پتیوں کو دور تک اُڑا لے جاتی تھی۔

میں کھڑکی میں بیٹھا۔ اِس بات کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ ہماری تیاری کب پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔

بڑھیا کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر وہ دفعتاً رک گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ رومال سے ڈھانپ لیا۔ اور بازو ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی میں نے اُس کی اِس حرکت کو دیکھا۔ مگر میری جانے کے لئے بیقراری اِس ہمدردی سے کہیں زیادہ تھی۔ لیکن ابّا اور ماں آپس میں گفتگو کرتے رہے۔

میں سخت بیقرار ہو گیا ہم دس منٹ تک اِس طرح بیٹھے رہے وہ وقت مجھے ایک گھنٹہ کے برابر معلوم ہوا۔ آخر سب اُٹھے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رخصت ہونے لگے۔ میری والدہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں الوداع کہنے کیلئے ٹانگہ تک آئیں۔

جب ہم کچھ دُور نکل گئے۔ تو میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کہ کوئی برآمدے سے سفید رومال ہلا رہا ہے۔ اِس کے جواب میں مَیں نے اپنا رومال ہلانا شروع کیا۔ میرے اِس فعل سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ پھر طبیعت بھر آئی۔ اور میرے آنسو میری رقیق القلبی کا بیّن ثبوت تھے۔

بچپن

ہم بچپن کے اِن خوشگوار لمحوں کو جو کبھی واپس نہ آئیں گے ۔کس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔ اِن ہی لمحوں کی یاد ۔میری رُوح میں تازگی اور بالیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ اور میری سب سے بڑی خوشی کا منبع ہے ابھی تک مجھے وہ واقعہ یاد ہے جب میں چائے کی پیالی ختم کر چکتا میں اس کے پیارے پیارے چہرہ کی طرف دیکھتا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھیں بیچ جاتیں ۔

میری والدہ مجھے آواز دیتیں ۔" تم پھر سو گئے ہو جاؤ اُوپر چلے جاؤ۔"

میں جواب دیتا۔ پیاری اماں ۔میں سو تو نہیں رہا ہوں ۔اور بچپن کی صحت پر ور نیند میری آنکھوں کو پھر بند کر دیتی ۔ کمرہ خالی ہو جاتا اور صرف پیاری اماں شفقت سے اپنے نازک ہاتھ میرے سر اور چہرے پر پھیرتی ۔اور اس کی پیاری اور شیریں آواز میرے کانوں میں آنے لگتی ۔

بچے اُٹھو۔ اب سونے کا وقت آگیا ہے ۔

میں غنودگی کی حالت میں اپنے بازو اُس کے گلے میں حمایل کر دیتا اور کہتا "امی جان تم مجھے کس قدر پیاری ہو۔ وہ میری پیشانی پہ بوسہ دیتی اور مجھے اپنے گود میں لٹا لیتی۔

ہاں تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر کہتی۔ اچھا تم مجھے ہمیشہ محبت کرو گے اور کبھی نہ بھولو گے۔ اگر میں اس دنیا میں نہ ہونگی۔ جب بھی نہ بھولو گے۔

میں اس سے کہتا چُپ میری پیاری اماں۔ پھر میں چلانے لگتا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ جاتی۔ محبت اور بیخودی کے آنسو...... اور میں اوپر جا کر دعا مانگتا "اے خدا اماں اور امی پر اپنی برکتیں نازل کر" اس وقت خدا اور والدہ کی محبت عجیب طریق سے ملی جُلی ہوئی تھی۔

پھر میں بستر پر پڑ کر سو جاتا۔ اور مجھے پاک محبت کے خواب دکھائی دینے لگتے۔ کیا اسی تازگی تفکرات سے آزادی، وفورِ محبت اور اعتقاد کی طاقت جیسی بچپن میں ہوتی ہے۔ پھر واپس آ سکتی ہے؟ اس سے اور کون سا وقت اچھا ہو سکتا ہے۔ جس میں نفیس ترین صفتیں..... معصوم محبت اور لاانتہا محبت ..... صرف زندگی کا مقصد ہو۔

اشعار

ہمارے ماسکو پہنچنے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہم ایک دن بڑی سی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ اور ہمارا ڈرائینگ ماسٹر والودیا کی ایک تصویر درست کر رہا تھا۔ جو اس کو دادی اماں کی سالگرہ پر پیش کرنی تھی چونکہ مجھے بھی کوئی نہ کوئی ہدیہ ان کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ اس لئے میں سوچنے لگا کہ کس چیز کو ان کے ہدیے کے لئے منتخب کروں۔ آخر مجھے خدا معلوم کس طرح یہ خیال آگیا کہ میں کچھ اشعار لکھ کر انہیں پیش کروں میں نے کچھ اشعار کہے۔ اور انہیں خوشخط لکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر تین کاغذ ردی کر دیئے۔ تب بھی مجھ سے خوشخط نہ لکھا گیا۔ میرے ان اشعار میں اس مفہوم کا ایک شعر تھا۔ "تم مجھے اتنی پیاری ہو جتنی کہ میری امّاں جان۔ یہ فقرہ میرے کانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ میں خیال کرتا تھا۔ کہ بیشک میں دادی اماں سے محبت کرتا ہوں۔ مگر اتنی نہیں جتنی کہ اپنی والدہ سے اس لئے میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ جھوٹ بولوں۔ چونکہ وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ ہم نے جلد جلد کپڑے پہنے۔ اور دادی اماں کو ہدیے دینے کے لئے اس کے کمرے میں

چلے گئے ۔ کارل ایوانانچ نے ایک چھوٹی سی صندوقچی پیش کی ۔ جو اُس نے خود تیار کی تھی ۔ دادی اماں نے اُسے بار بار دیکھا ۔ اور اپنے پاس رکھ لیا ۔ اس کے بعد والودیا نے اپنی بنائی ہوئی تصویر پیش کی اُسے بھی اُنہوں نے لے کر اپنے پاس رکھ لیا ۔ میں اتنا عرصہ جھجکتا اور کانپتا رہا ۔ آخر میری باری آگئی اور میں نے وہ اشعار پیش کر دیئے چونکہ ان کی نظر کمزور تھی ۔ اس لئے اُنہوں نے میرے ابا کو وہ کاغذ دے دیا کہ ان کو پڑھ کر سنائیں ۔ جب وہ سن چکیں ۔ تو انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا ۔

شہزادی اور شہزادہ

تمام دن مُبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا ۔ اُسی دن ایک شہزادی دادی اماں کو مُبارکباد دینے آئی ۔ اُنہوں نے اس سے میری شاعری کا ذکر کیا ۔ اس نے عجیب طریقہ سے میری طرف دیکھا ۔ میں جانتا تھا کہ میں خوبصورت نہیں ہوں ۔ کیونکہ میری صُورت کے متعلق جو تنقید کی جاتی مجھے وہ سخت ناگوار معلوم ہوتی مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جب ہم کھانا کھا رہے تھے ۔ تو میری والدہ نے میرے متعلق کہا ۔

اِس کی شکل میں کچھ خاص بات ہے۔ مگر میرے ابّا نے دلائل سے انہیں قائل کر دیا۔ کہ وہ غلطی پر ہیں۔ پھر میری امّاں جان نے مجھے بُلا کر میری گالوں کو پھٹکا۔ اَور مجھ سے کہا۔ بچّے تمہاری شکل کی وجہ سے کوئی تمہیں پیار نہیں کرے گا۔ اِس لئے تم ہوشیار اَور اچھا لڑکا بننے کی کوشش کرو۔ اِس دن مجھے اپنی بد صورتی کا یقین ہو گیا۔ اور اچھا بننے کا خیال میرے دل میں راسخ ہو گیا۔

اس کے باوجود میں بعض موقعوں پر نا اُمید سا ہو جاتا۔ اور سوچنے لگ جاتا۔ کہ ایسے لڑکے کے لئے جس کی ناک میری طرح چپٹی ہونٹ موٹے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں۔ دنیا میں کوئی خوشی نہیں ہو سکتی اور میں دُعا مانگا کرتا "اَے خدا کوئی ایسا مُعجزہ دکھا۔ کہ میں خوبصورت بن جاؤں"۔ اس خوبصورت چہرہ کو حاصل کرنے کے عوض میں جو کچھ اِس وقت میرے پاس تھا۔ یا آئندہ ملتا۔ دے دینے کے لئے تیار تھا۔

اس کے بعد ایک شہزادہ تشریف لایا۔ اُس کی تمام حرکتیں عجیب مضحکہ خیز اور پاگلوں کی سی تھیں۔ اور اگر اس کی ظاہرہ شان اس قدر نہ ہوتی۔ تو شاید کوئی اِس سے ملنا بھی پسند نہ کرتا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ مگر اس کی تعلیم جوانی ہی میں ختم ہو چکی تھی۔ مشہور مشہور

مصنفوں کی تصانیف کے نام بھی اس کو یاد تھے۔ اور گفتگو کرتے وقت گوئٹے، شیلے اور بائیرن کے متعلق وہ خاص خاص فقرے بھی بولتا تھا۔ اگرچہ اُس نے اِن مصنفوں کو پڑھا نہیں تھا۔

اس میں ایک صفت تھی۔ کہ وہ بہت خوبصورت تھا۔ جب میرے اشعار اُسے سُنائے گئے۔ تو اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اُس نے میری تعریف کرنے کے بعد میرے رخساروں پر زور سے چٹکی لی۔ اور میں صرف اِس وجہ سے نہ چلایا۔ کہ اس کا مقصد اس سے محبّت کرنا تھا۔

ایونز

ایونز ہمارے رشتہ دار تھے۔ اور ہم عمر بھی اور ماسکو پہنچتے ہی ان سے اور ہم سے تعارف ہو گیا تھا۔ اور ہم آپس میں دوست بن گئے تھے۔

ایون سرزا کے بال گھنے اور سیاہ تھے۔ اِس کی ناک سونوان تھی خوبصورت نیلی نیلی آنکھیں اور اِس کا چہرہ غیر معمولی طور پر پیارا تھا۔ وہ بہت مسکراتا تھا یا تو وہ خاموش رہتا۔ یا کھِل کھلا کر ہنستا تھا۔ اُس کی اِس قدرتی خوبصورتی نے مجھے پہلے ہی نظر میں مبہوت کر دیا۔ گویا میں اِس

کیطرف کھینچا جا رہا تھا صرف اس کو دیکھ لینا میری خوشی کا کافی باعث ہوتا تھا۔ اگر میں اس کو دو چار دن تک نہ دیکھ سکتا۔ تو میں سخت مضطرب رہتا اور اتنا افسردہ ہو جاتا کہ چلانے کو جی چاہتا۔ سوتے جاگتے اس کی صورت میری آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ سوتے وقت مجھے اُسے خواب میں دیکھنے کی آرزو ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب میں آنکھیں بند کر لیتا۔ تو اُس کو اپنے سامنے پاتا۔ اور ان خوابوں کو اپنی انتہائی خوشی خیال کرتا میرے لئے یہ جذبہ اس قدر قیمتی تھا۔ کہ میں کسی سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔

شاید اس وجہ سے کہ میری آنکھیں ہر وقت اس کے چہرے پر گڑی رہتی تھیں۔ وہ اس سے اکتا گیا تھا۔ یا اُس کو میری جانب کوئی کشش نہ تھی۔ وہ ہمیشہ والو دیا کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دیتا۔ اس کے باوجود میں اس سے مطمئن تھا۔ اُس سے کسی چیز کا خواہشمند نہ تھا۔ اور اس کے لئے ہر ایک چیز قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ میرے دل میں یہ جذبات نہایت شدت سے جاگزین ہو گیا۔ کہ کہیں اس کو مجھ سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی۔ کہ وہ تند خو معلوم ہوتا تھا۔ یا یہ کہ میں دوسروں کے حُسن کو بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اور یا عشق کی یہ بھی کوئی کیفیت تھی۔

بہرحال میں اِس سے اتنا ہی خائف رہتا جتنا اِس سے محبت کرتا۔ جب سرنا نے پہلے پہل مجھ سے بات چیت کی۔ تو میں اِس اچانک اور غیر متوقع خوشی سے اس قدر گھبرا گیا۔ کہ میرا چہرا زرد ہو گیا۔ اور میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ اِس میں یہ ایک بُری عادت تھی۔ کہ جب وہ کچھ سوچا کرتا۔ تو اپنی آنکھوں کو ایک جگہ جما دیتا بار بار انہیں جھپکتا۔ اور اپنی ناک کو بار بار جنبش دیتا۔ سب کا خیال تھا۔ کہ اس کی یہ عادت لوگوں کو بہت معیُوب معلوم ہوتی تھی۔ مگر مجھے وہ ایسی بھلی معلوم ہوتی۔ کہ میں بغیر قصد کئے اسی طرح کرنے لگ جاتا۔ اور اِس کی واقفیت کے تھوڑے دن بعد میری دادی اماں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ تم ہر وقت اپنی آنکھوں کو اُلو کی طرح کیوں جھپکتے رہتے ہو۔ کیا تمہیں درد معلوم ہوتا ہے؟ ہم میں کبھی بھی محبت کی گفتگو نہ ہوئی۔ اُسے اپنے رُعب کا یقین ہو گیا۔ اور وہ ہماری ان بچپن کی ملاقاتوں میں نہایت سختی سے اسکا استعمال کرتا رہا۔ میں اس کو اپنی رُوح کی کیفیت بتانے سے زیادہ اس سے ڈرتا رہتا۔ اور اِس سے کھل جانے کی جرأت نہ کر سکتا۔ اور بغیر شکوہ و شکایت کے اس کا مطیع ہو جاتا۔ بسا اوقات اس کی سختی ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی لیکن اِس سے بچ جانا میری طاقت سے باہر تھا۔

میں چاہتا تھا۔ کہ اِسے بوسہ دوں یا اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے

کہوں کہ میں تم سے مِل کر بہت خوش ہوں مگر میں اِس کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بلکہ میں اِس کو سرزہا کے نام کی بجائے سرجے کہہ پکارتا۔ بڑے بوڑھے لوگوں کے اِن تجربوں سے جو اِن کے تعلقات میں سرد مہری کا موجب ہوتے ہیں۔ بالکل ناآشنا تھے۔ تاہم ہم نے اپنے آپ کو بچپن کی اِس پاک خوشی سے بالکل محروم کر دیا تھا وہ محض اِس وجہ سے کہ ساری عجیب خواہش ان بڑے لوگوں کی سی تھی۔

میں نے ایونز کا اِستقبال کیا۔ اور نہایت خوشی سے دادی اَماں کو ایسے لہجے میں اطلاع دی جس سے اُسے مکمل خوشی حاصل ہو۔ پھر میں سرزہا کے پیچھے پیچھے اِس حرکت کو نہایت غور سے دیکھتا ہُوا اندر داخل ہُوا۔ دادی اَمّاں نے اپنی آنکھوں کو اِس کے چہرہ پر جماتے ہوئے کہا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اِس وقت مجھے اِس طرح کا خوف پیدا ہوا جس طرح ایک مصوّر کو پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے کام کی تکمیل کے بعد کسی نقاد کے فیصلے کا منتظر ہو۔ ایونز کا اتالیق دادی اَمّاں کی اجازت سے باغ میں چلا گیا۔ اور نہایت مطمئن طریقے پر اُس نے اپنا سگار سلگایا باغ میں جا کر ہم نے چور چور کھیلنا شروع کیا۔ ہم نہایت انہماک سے اِس میں مشغول تھے۔ کہ ایک حادثہ ہُوا جس سے کھیل قریباً بالکل بند ہو گیا۔ سرزہا چور بنا ہوا تھا۔ اور راہگیروں کا پیچھا کرتے

ہوئے وہ دُور ہم سے گرا۔ اس کا گھٹنہ بہت زور سے درخت کے ساتھ ٹکرایا۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اگرچہ میں سپاہی تھا۔ اور میرا فرض تھا۔ کہ میں اُسے گرفتار کر لیتا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ اور محبت سے اُسے پوچھنے لگا "تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟" سرِ رہا اس سے سخت برہم ہوا۔ اور چلّا کر بولا تمہیں اس سے کیا، کیا اس طرح سے کھیلا کرتے ہیں؟ تم نے مجھے گرفتار کیوں نہیں کیا؟ اس نے اس فقرہ کو کئی بار دُھرایا اور ترچھی نگاہ سے والو وبا دغیرہ کو دیکھا۔ جو بس اُسی وقت بھاگ گئے۔ اور وہ بھی گرجتا ہؤا ان کے پیچھے بھاگ گیا۔ مجھ پر اس کے اس بہادرانہ سلوک کا بہت اثر ہؤا۔ باوجود سخت تکلیف کے اس نے کوئی چیخ پکار نہ کی۔ بلکہ اس نے یہ بھی ظاہر نہ کیا۔ کہ اس کے کہیں چوٹ آئی ہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے کھیل کو فراموش نہ کیا۔

باغ میں کھیلنے کے بعد ہم اوپر کے کمرے میں چلے گئے اور الینکا گریپ آکر ہم میں شامل ہو گیا۔ النکا گریپ ایک غریب پردیسی کا لڑکا تھا۔ جو پہلے ہمارے والد کے گھر رہتا تھا۔ اور ان کا ممنونِ احسان تھا۔ اور اب اپنے لڑکے کو ہمارے ہاں بھیجنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا۔ کہ اس کا لڑکا ہم سے مل کر کوئی عزت یا خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ تو وہ اس معاملے میں قطعاً غلطی پر تھا۔ کیونکہ ہمیں اس سے

کوئی دوستانہ تعلق نہیں تھا۔ بلکہ ہم جب اُسے دیکھ پاتے۔ تو اُس کا مذاق اُڑاتے۔ وہ ایک پتلا اور مطیع لڑکا تھا۔ نہایت غریبانہ لباس میں رہتا۔ اور اس وقت ہمیں ایسا مکرُوہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم اُس کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوئے۔ اور اِس کو ہرگز قابلِ رحم خیال نہ کرتے۔

جب ہم اُوپر کے کمرے میں پہنچے۔ تو ہم جمناسٹک کرنے لگے۔ اور باری باری ہر ایک اپنے اپنے کرتب دکھانے لگا۔ سرز ہا نے ایسے ایسے کرتب دکھائے۔ کہ سب کھل کھلا کر ہنستے۔ اِس کے بعد وہ الینکا کی طرف جھپٹا۔ اور اُسے اپنے ایک کھیل کی نقل کرنے کو کہا۔

النکا نے جب دیکھا کہ سب کی توجہ اِس کی طرف ہے۔ تو وہ گھبرا گیا۔ اور نہایت پست آواز میں بولا۔ کہ میں تو یہ نہیں کر سکتا سرزہا نے اِس کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور کہا کہ کیوں نہیں۔ تم کوئی بچے تو ہو نہیں تمہیں سر کے بل کھڑا ہونا پڑے گا۔ سب نے اِس کی تائید کی۔ اور کسی نے اِس کی ٹانگیں کسی نے بازو کسی نے سر اور کسی نے کمر پکڑ کر اُسے اُٹھا کھڑا دیا۔ جس قدر وہ چلاتا اُسی قدر نہایت جوش سے اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا۔ اور اپنی ٹانگوں کو جھٹکتا۔ اِس کھینچا تانی میں سرزہا کی ایک آنکھ

پر چوٹ لگی۔ اور اس نے اس کی ٹانگوں کو چھوڑ دیا۔ البنکا وڑہم سے گر پڑا۔
اور سرز ہا نے ایک کتاب اُٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔
میرا دل ایسا کمزور تھا۔ کہ اگر کوئی پرندہ گھونسلے سے نیچے گر پڑتا۔
یا کسی چوزے کو پکانے کے لئے لیجا رہے ہوتے۔ تو میں اس کو دیکھ کر
چلانے لگ جاتا۔ مگر اس واقع کا مجھ پہ کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

مہمانوں کی آمد

یہ امر یقینی تھا۔ کہ اس شام ہمارے ہاں خوب گہما گہمی رہتی۔ میں
الونیز کے انتظار میں اوپر کے کمرے سے جھانکتا رہا سامنے کی سڑک
پر اندھیرا تھا۔ اور ایک دُکان کے سوا کسی جگہ روشنی کا نام تک نہ تھا
اور اس لئے اچھی طرح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کہ کبھی کی گاڑی چلی
آتی ہے ایک گاڑی پر مجھے شک ہوا۔ اور میں سمجھا کہ ایونز کا تانگہ آرہا ہے
کیونکہ جاتی دفعہ وہ وعدہ کر گئے تھے۔ کہ ہم بہت جلد واپس آجائیں گے
میں ان کے استقبال کے لئے نیچے اُترا۔ مگر میں یہ دیکھ کر سخت حیران
ہوا۔ کہ دو عورتیں ہمارے کمرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ ان میں سے
ایک کا قد لمبا تھا۔ اور دوسری کا چھوٹا۔ لمبی عورت نے بڑھ کر چھوٹی کا

فراک اتارا۔ اور اس کے اندر سے بارہ سال کی ایک خوش وضع لڑکی نمودار ہوئی۔ جس کا سر نہایت نفیس گھنگھریالے بالوں سے ڈھپا ہوا تھا۔

اس کے چہرے کی دل کو موہ لینے والی غیر معمولی بڑی بڑی نیم وا آنکھیں جو اس کے چھوٹے سے منہ پر نہایت بھلی معلوم ہوتی تھیں اسکے ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں سے ایسی تمکنت ظاہر تھی۔ کہ جس کو دیکھ کر آدمی خیال کرتا تھا۔ کہ وہ کبھی بھی مسکرائی نہ ہوگی اس لئے اس کی مسکراہٹ میں جادو بھرا ہوگا میں نے انہیں دیکھ کر اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا کہ میں کسی گہرے سوچ میں کھویا ہوا ہوں۔ اور ان کی آمد سے بالکل بے خبر ہوں۔ جب میں ان کے پاس پہنچا۔ تو ٹھٹک کر جھکا اور انہیں سلام کیا۔ اور انہیں اپنی دادی اماں کے کمرے میں لے گیا۔ میری دادی اماں انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اور اس لڑکی کو اپنے پاس بٹھایا۔ اور اس کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "کیسی خوبصورت بچی ہے"۔ سوہنیا مسکرائی۔ اور اس کے چہرہ پر سرخی مدھم گئی۔ جس سے وہ اس قدر بھلی معلوم ہونے لگی۔ کہ اس کو دیکھ کر میرے چہرے پر بھی سرخی دوڑ گئی۔ اور ان سے مل کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی۔

پھر میں اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہاں شہزادی صاحبہ کو دیکھا جو اپنے بہت سے بچوں کو لے کر تشریف لے آئی تھیں۔ اِن کی کو چبان سے کچھ جھڑپ ہو رہی تھی۔ میں اِن سے نظر بچا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا وہاں سے میں سوہنا کو دیکھ سکتا تھا۔ اس نے میری تمام تر توجہ کو اپنی طرف کھینچ رکھا تھا۔ اور جب کبھی مجھے کوئی اچھی سی بات کہنی ہوتی۔ تو میں بہت بلند آواز سے کہتا۔ اور سامنے والے کمرے میں دیکھنے لگ جاتا۔ آخر جس کمرے میں مَیں تھا۔ وہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ جب ایونسز پہنچے۔ تو اِس خوشی کی بجائے جو اس سے مل کر مجھے حاصل ہوتی تھی۔ میں اس سے سخت رنجیدہ ہو گیا۔ کیونکہ وہ سوہنا کی طرف دیکھتا تھا۔ اور سوہنا اس کی طرف

ناچ

شام کا وقت ہوا۔ تو ہم ناچ کی تیاریاں کرنے لگے سرزہا نے اپنی جیب سے نئے دستانوں کا ایک جوڑا نکالا۔ اور اپنے ہاتھوں میں پہن لیا۔ میرے پاس کوئی دستانہ موجود نہ تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ میں اوپر کے کمرے میں چلا گیا۔ اور اس اُمید پر سب

جگہ تلاش کی۔ شاید کہیں سے دستانہ دستیاب ہو جائے۔ آخر میز
کے ایک دراز میں مجھے ایک بوسیدہ اور گندہ سا دستانہ پڑا ہوا
ملا۔ ایک تو میرے لئے وہ بہت بڑا تھا۔ دوسرے سخت میلا
کچیلا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر اس کی درمیانی انگلی غائب تھی جسے بہت مدت
ہوئی کرل ایوانا ویچ نے اپنی انگلی کے ایک زخم کی وجہ سے کاٹ ڈالا
تھا۔ میں نے ان دستانوں کو پہن لیا۔ اور نہایت غور سے اپنی
درمیانی انگلی کا معائنہ شروع کیا جس پر ہمیشہ سیاہی کے دھبے
پڑے رہتے تھے۔ اتنے میں والوریا آ پہنچا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ تم
یہاں کیا کر رہے ہو۔ نیچے جاؤ۔ اور کسی لڑکی کو منتخب کر لو۔ وہ تو ناچ
شروع کرنے والے ہیں۔ میں نے اپنے دستانوں کا دہ جوڑا دکھایا
اور نہایت مایوسانہ آواز میں کہا۔ کہ میں تو شامل نہیں ہو سکتا۔ پھر کچھ
سوچ کر دادی اماں کے پاس گیا۔ اور آہستہ سے کہا۔ کہ میرے پاس
دستانہ نہیں ہے۔ اس نے میرے بائیں ہاتھ کو زور سے پکڑ رکھا۔
اور سونیا کی والدہ کو مخاطب کر کے کہا۔ دیکھو! یہ تمہاری لڑکی کے ساتھ
ناچنے کے لئے تیار ہو کر آیا ہے۔ سونیا قہقہے لگا کر ہنسی۔ یہاں تک کہ
اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس کے گھنگریالے بال
اس کے سرخ چہرے پر منتشر ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ اس کی

ہنسی بہت ہی قدرتی اور پُر محبت تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنستے تھے۔ مجھ میں شرمندگی کے کوئی آثار موجود نہ تھے
دراصل آدمی کو اس وقت شرم آتی ہے۔ جب اُسے یہ معلوم نہ ہو۔ کہ سوسائٹی میں اس کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی۔ جب
رائے کا اظہار صاف طور پر کیا جائے (خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو) تو شرمندگی کی تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ جب سوینا ناچنے لگی۔ تو وہ
اس قدر پیاری اور اس قدر خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ کہ دل اس کی طرف بیتابانہ کھینچا جاتا تھا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ میرے
ہاتھ میں دیا۔ تو وہ بہت پیاری پیاری ہنسی ہنسی اسی طرح ہم دیر تک ناچتے رہے میں نے واپسی میں اس کے ساتھ کچھ گفتگو کی جس میں
میں نے اپنی قابلیت کا اظہار کر دیا۔ اس وقت مجھ پہ وجد کی کیفیت طاری تھی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ یہاں تک کہ میں اس وقت
اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکتا تھا۔ ناچ ختم ہونے کو تھا۔ کچھ لوگ ڈوی
اماں سے اجازت لے کر روانہ ہو رہے تھے۔ سوینا نے اپنی والدہ
کو مجبور کیا۔ کہ وہ آج رات کو ہمارے ہاں ہی ٹھہرے۔ اس کی ماں
نے پہلے تو جواب دیا کہ اِس طرح میری صحت پر بہت بُرا اثر پڑیگا
مگر پھر وہ مسکرائی اور سوینا نے جب اس کی مسکراہٹ کو دیکھا۔

تو اُس نے کہا۔ اب تو مان گئی ہو۔ اب ہم ضرور ٹھہریں گے۔ اس کی والدہ نے کہا۔ اچھا جاؤ۔ ناچو اور میری طرف اشارہ کیا۔ کہ تمہارے لئے وہ ننھا موجود ہے۔

سونیا نے اپنا ہاتھ مجھے دے دیا۔ اور ہم اپنے کمرے میں بھاگ گئے میں نے اس کی موجودگی میں نہایت خوش کن حرکتیں کیں۔ کبھی گھوڑے کی طرح دوڑتا۔ کبھی مینڈھے کی طرح گھورنے لگ جاتا۔ وہ میری یہ حرکتیں دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی جب میں یہ حرکتیں کر رہا تھا۔ اس وقت میرے چہرے پر پسینہ آ گیا تھا۔ اور میرے بال بکھرے ہوتے تھے۔ میں نے شیشے میں دیکھا۔ تو مجھے اپنا چہرہ بہت بھلا اور چمکیلا معلوم ہوتا تھا۔ مگر جونہی میری نظر سونیا کے پیارے چہرے پر پڑی۔ تو اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر میں اپنے آپ سے کچھ ناراض ہو گیا مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یہ خیال کیونکر پیدا ہوا۔ کہ میں اس عجیب ہستی کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر سکوں گا۔ مجھے کبھی خیال بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور خواہش بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے اُسے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا کیا خوشگوار موسم ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ہاں واقعی۔ کچھ دیر ہم آپس میں میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ کہ ہم جلدی

ہی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور شاید پھر کبھی نہ مل سکیں گے ہیں نے کہا کہ بے تکلفی میں ہمیں "آپ" کی بجائے "تو" استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بے تکلف دوستوں کا بھی دستور ہے۔ مگر میں پاس ادب کی خاطر کبھی اس کو مخاطب کرتے وقت "تو" کا لفظ استعمال نہ کر سکا۔ اور وہ بار بار مجھے اس پر ٹوکتی رہی آخر اس نے مجھے بتایا۔ کہ ہم فلاں مقام پر سیر کے لئے جایا کرتے ہیں۔ تم بھی وہاں آجایا کرو۔ تو آپس میں مل سکیں گے۔

ڈال دیا۔ ایونسز اور نوجوان شہزادہ سوہنا کے دام الفت میں اسیر ہو چکے تھے۔

جب وہ رخصت ہوئی۔ تو ہم سیڑھیوں کی چوٹی پر بیٹھ کر نظر سے اس کا تعاقب کرنے لگے۔ جب وہ کچھ دور چلی گئی۔ تو اس نے جھک کر سلام کیا۔ مجھے معلوم نہیں۔ کہ اس نے کس کو سلام کیا۔ مگر اس وقت مجھ کو مکمل یقین تھا۔ کہ اس نے مجھے ہی سلام کیا تھا۔ اس نے جدا ہونے کے بعد سے سوزہا نے نہایت بے تکلفی سے ملا اور اس کا وہ رعب مجھ پر نہیں رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں محبت میں بے وفا ثابت ہوا۔ اور یہ بھی پہلا موقع تھا۔ کہ میں نے پڑھنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو نہ تجربہ حاصل کیا۔ میرا تجربہ ہے۔ کہ پہلی

[illegible]

محبت کو ترک کر کے نئے سرے سے اس میں داخل ہوں۔ تو پہلی دفعہ کی محبت سے دوسری دفعہ کی محبت دگنی طاقت سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

سوتے وقت

جب میں بستر پر لیٹا۔ تو میں سوچنے لگا۔ کہ سرزہا سے مجھ سے ایسی شدت کی محبت کیونکر تھی۔ وہ میری محبت کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ اس کی قدر ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس لئے میری محبت کے قابل ہی نہ تھا۔ مگر سوہنا .... پیاری سوہنا۔
میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ میں نے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ میں دل ہی دل میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میری وہ بے معنی گفتگو میرے لئے نہایت پُرلطف تھی۔ کیونکہ اس میں لفظ "تو" کی تکرار ہوتی تھی۔ میں اس وقت اس قدر خوش تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ میری اس خوشی میں کوئی اور بھی شریک ہو۔ میں نے کروٹ لی۔ اور اونچی آواز سے کہا پیارے والو دیا کیا سو گئے ہو۔
اس نے خواب آگیں آواز میں کہا۔ کیوں۔ میں نے کہا والودیا

مجھے سونیا سے بہت محبت ہے۔ اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ اچھا۔

آہ والودیا تم نہیں سمجھ سکتے۔ کہ مجھ پر کیا بن رہی ہے۔ وہ مجھ سے اس قدر صاف باتیں کر رہی ہے۔ کہ حیرانی ہوتی ہے۔ اور جب میں اس کا خیال کر کے سوتا ہوں۔ تو خدا جانے میں کیوں اداس ہو جاتا ہوں۔ اور میرا جی کیوں چلّانے کو چاہتا ہے

والودیا ذرا ہلا۔

میں نے کہا۔ کہ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہوں۔ اور ہمیشہ اُسے دیکھتا رہوں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ والودیا صاف صاف کہہ دو۔ کیا تم بھی اس سے محبت کرتے ہو ؟

یہ عجیب بات تھی۔ کہ میں ہر ایک کو سونیا کی محبت میں گرفتار دیکھنا چاہتا۔ اور ہر ایک سے اسی کے متعلق گفتگو کرنی چاہتا والودیا نے میری طرف مُنہ موڑتے ہوئے کہا۔ ارے تجھے کیا کام ہے شاید!

میں نے اس کی جھکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا۔ اور کہا۔ کہ تم سو تو نہیں رہے۔ یونہی بہانہ کرتے ہو۔ کہ تم سو رہے ہو

آؤ ہم اسی کے متعلق باتیں کریں ۔ وہ کس قدر خوبصورت ہے ۔
ہائے اب میرا چلّانے کو جی چاہتا ہے ۔

اس نے جواب دیا۔ تم کیا بیوقوف ہو۔ میرا حال تمہاری طرح نہیں ہے ۔ اگر ممکن ہو۔ تو میں چاہتا ہوں۔ کہ اس کے پاس بیٹھا رہوں اور اس کے ساتھ باتیں کروں۔

میں نے دریافت کیا۔ کیا تم بھی اس سے محبت کرتے ہو؟ والوڈیا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں اس کی ننھی ننھی انگلیوں ، اس کی آنکھوں، اس کے ہونٹوں، اس کی ناک اور اس کے پاؤں اور جسم کے ہر حصے کو چوموں .... میں نے چلّاتے ہوئے کہا۔ بیوقوف کہیں کا ۔

والوڈیا نے حقارت سے کہا۔ تم کچھ نہیں سمجھ سکتے ۔ میرے آنسو بہنے لگے ۔ اور میں نے جواب دیا۔ ہاں تم بیوقوف ہو ۔ تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اس نے کہا۔ بہرحال کوئی وجہ نہیں کہ تم یوں چلاؤ ۔

خط

متذکرہ بالا دن کے تقریباً چھ ماہ بعد بتاریخ ۱۶ اپریل ابا جان ہمارے کمرے میں تشریف لائے اور کہنے لگے۔ کہ آج رات ہم سب شہر کو واپس چلے جائیں گے ۔ اس خبر سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ اور میرا خیال فوراً اماں جان کی طرف پلٹ گیا۔ اس غیر متوقع جدائی کا موجب مندرجہ ذیل خط تھا۔

پرڈاوسکو

۲ اپریل میرے پیارے

رات کے دس بجے مجھے تمہارا ۳۱ اپریل کا لکھا ہوا خط ملا حسبِ معمول میں اسی وقت اس کا جواب لکھ رہی ہوں ۔ ممی نے یہ خط تمام دن مجھے نہیں دکھایا۔ کیونکہ میری طبیعت سخت علیل تھی۔ میں آج چار دن سے ہلکے ہلکے بخار میں مبتلا ہوں ۔ اور بستر سے نہیں اٹھ سکتی آپ گھبرائیں نہیں آج مجھے کچھ صحت ہو رہی ہے ۔ اور امید ہے ۔ کہ کل تک بستر سے اٹھ بیٹھوں گی ۔

پچھلے جمعہ میں بچوں کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر سیر کے لئے گئی

تھی۔ وہاں سردی کی وجہ سے مجھے کچھ حرارت سی محسوس ہوئی اور
پھر اچانک ہی میری یہ حالت ہو گئی۔ کہ میں نبض کی رفتار بھی نہ معلوم
کر سکتی تھی۔ میں یونہی کچھ بڑبڑاتی رہی۔ اور مجھے اپنے آپ پر بالکل
قابو نہ رہا۔ آخر ممی نے آ کر میری امداد کی۔ اور مجھے اندر لے جا کر بستر
پر لٹا دیا۔ کل میری حرارت بڑھ گئی تھی۔

بوبیا تمہیں خود خط لکھنا چاہتی تھی۔ مگر اِس خیال سے کہ اگر اس سے
کوئی غلطی ہو گئی۔ تو تم اُسے بہت تنگ کرو گے۔ اس لئے وہ اس سے
باز رہی۔ تم نے لکھا تھا۔ کہ موجودہ سردیوں میں میرا کام کاج اچھا
نہیں رہا۔ اور تمہیں کسی اور سے روپیہ قرض لینا پڑا ہے۔ میں بہت
حیران ہوں۔ کہ تم اِس معاملے میں میری اجازت چاہتے ہو۔ کیا جو کچھ
میری ملکیت ہے۔ وہ تمہاری نہیں؟ اصل میں تم اِس خیال سے کہ
مجھے تکلیف پہنچے گی۔ اپنے حالات مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ تم جوئے
میں روپیہ ہار چکے ہو گے۔ بہر حال میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تمہارا
جیتنا میرے لئے اتنا ہی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ جتنا کہ تمہارے
ہار جانے کا غم مجھے رنج صرف تمہاری اس بُری عادت کا ہے جو مجھے
تم سے کچھ علیحدہ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے۔ کہ مجھے اس سے
کس قدر صدمہ پہنچتا ہے۔ میں ہمیشہ دُعا مانگتی رہتی ہوں۔ کہ وہ

تمہیں اِس سے بچاتا رہے۔ جائداد نہیں رجائیداد کی حقیقت ہی کیا ہے، بلکہ اولاد کا نفع و نقصان مدنظر ہے۔ جس کے لئے مجھے جدوجہد کرنی چاہئے جائیداد بچوں کی ملکیت ہے۔ اور ہمیں اس پر کوئی حق نہیں۔

تم بچوں کو سکول بھیجنے کے لئے میری اجازت چاہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں ایسی تعلیم کے کس قدر خلاف ہوں۔ ان دنوں بہار اپنے شباب پر ہے۔ اور آج لوبیا نے بہار کا پہلا پھول مجھے لاکر دیا ہے ڈاکٹر کی رائے ہے کہ میں دو تین دن میں صحت یاب ہو جاؤں گی۔ اور تازہ ہوا کھانے کے قابل ہو سکوں گی۔ اور دھوپ کی تاب لا سکوں گی۔ خدا حافظ پیارے۔ خدا حافظ۔ تم میری بیماری کے متعلق تشویش نہ کرنا اور اپنے معاملات کو جلدی نپٹا کر بچوں سمیت یہاں چلے آؤ۔ اور اگر یہاں یہاں ہی بسر کرنا۔ میں نہایت عمدہ تجویزیں سوچ رہی ہوں۔ اور صرف تمہاری موجودگی کی ضرورت ہے۔

خط کا مندرجہ ذیل حصہ فرانسی زبان میں لکھا تھا جس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس پر یقین نہ کرنا۔ مرض کے مُہلک ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بستر سے نہیں اٹھ سکوں گی بچوں کو لے کر فوراً تشریف لے آئیے شاید میں ان سے آخری بار پیار

کر سکوں ملطانہیں اپنے سینے سے چمٹا سکوں۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ میں جانتی ہوں۔ کہ تمہیں کس قدر صدمہ پہنچا رہی ہوں۔ مگر ہر حالت میں جلدی یا بدیر تمہیں یہاں پہنچنا ہی ہے۔ ہمیں مضبوطی سے خدا کے رحم پر اعتبار کرتے ہوئے اس مصیبت کو برداشت کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں خدا کی مرضی کے سامنے سر خم کر دینا چاہئے۔

یہ مت خیال کرنا کہ میں بیماری کی حالت میں دماغ کی خرابی کے باعث بک رہی ہوں۔ بلکہ میرا دماغ اس وقت بالکل درست ہے۔ اور میری حالت پر سکون ہے۔ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی نہ دے لینا کہ یہ ایک ناتواں ہستی کی پیشین گوئی ہے۔ نہیں میں محسوس کرتی ہوں میں جانتی ہوں .... کیونکہ خدا نے اپنی مہربانی سے مجھ پر یہ روشن کر دیا ہے .... کہ میری زندگی کا اب بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے۔

کیا بچوں کی اور تمہاری محبت کا خاتمہ ہو جائے گا؟ میرے خیال میں یہ ناممکن ہے۔ وہ جذبہ جس کے بغیر میں زندگی کو زندگی نہیں سمجھ سکتی کبھی مٹ سکتا ہے؟ میری روح تمہاری محبت کے بغیر کبھی نہیں رہ سکتی ہیں تمہارے پاس نہ ہوں گی۔ مگر مجھے پورا یقین ہے۔ کہ میری محبت تمہیں نہ چھوڑے گی۔ یہ خیال میرے دل کیلئے

بہت راحت بخش ہے۔ اب میں سکون کی حالت میں ہوں۔ اور بغیر کسی خوف کے موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب میں آرام میں ہوں۔ اور خدا جانتا ہے۔ کہ میں ہمیشہ موت کو زندگی کی شاہراہ سمجھتی رہی ہوں اور اس وقت بھی سمجھتی ہوں۔ مگر آنسوؤں کی وجہ سے میرا گلہ گھٹا جاتا ہے۔ بچوں کو کیوں اپنی پیاری ماں سے علیٰحدہ کیا جا رہا ہے تمہیں اِس قدر سخت صدمہ کیوں پہنچایا جا رہا ہے! مجھے کیوں موت آرہی ہے۔ جب تمہاری محبت نے میری زندگی کو بے اندازہ خوشگوار بنا دیا تھا؟ اچھا خدا کی مرضی۔

میں آنسوؤں کی وجہ سے زیادہ نہیں لکھ سکتی ممکن ہے پھر تمہیں نہ دیکھ سکوں۔ میرے پیارے میں تمہاری ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور وہاں خدا سے دعا مانگوں گی کہ تمہیں اس کا اجر دے۔ پیارے دوست خدا حافظ۔ میرے نکوسں خدا حافظ۔ کیا تم مجھے بھول جاؤ گے؟

اِس خط میں ممی کا لکھا ہوا ایک اور پرزہ موجود تھا۔ اس کا ترجمہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

یہ المناک حالات جو آپ کو لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے ان کی پوری تصدیق کی ہے۔ کل رات میں اُس نے رائے دی تھی۔

کہ اس خط کو فوراً ڈاک میں ڈال دو ۔ اس خیال سے کہ اس کی دماغی
کیفیت اچھی نہ تھی۔ میں نے صبح تک انتظار کیا ۔ اور اس کو کھولنے کا
ارادہ کیا۔ میں نے ابھی اس کو کھولا ہی تھا کہ نکولا نے مجھ سے آکر کہا۔
کہ اگر خط کو ابھی تک نہیں بھیجا۔ تو اُسے فوراً جلا دو ۔ اُس نے مجھے
یقین دلایا۔ کہ آپ اس کو پڑھ کر جانبر نہ ہو سکیں گے ۔ اگر آپ اس
فرشتے کو ہم سے جدا ہونے سے پہلے دیکھنا چاہتے ہیں تو فوراً یہاں
پہنچ جائیں ۔ میں آج تین راتوں سے نہیں سوئی ۔ آپ جانتے ہیں کہ
مجھے اِن سے کتنی محبت تھی ۔

شہر میں ہم پر کیا گذری

پچیس اپریل کو ہم نے آنے کی تیاری شروع کر دی ۔
اباجان نہایت غمگین تھے ۔ والودیا نے اِن سے دریافت کیا کیا
اماں جان بیمار ہیں؟ انھوں نے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا
اور منہ سے بولے بغیر سر ہلا دیا ۔ باقی حصہ سفر میں وہ بالکل چاہتو تے
رہے اور جب ہم گھر پہنچے تو ان کا چہرہ بہت ہی پر حسرت ہو گیا ۔
ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اور انھوں نے نوکا سے میری

والدہ کے متعلق دریافت کیا۔

اس نے جواب دیا۔ کہ آج چھٹے دن سے وہ بستر سے نہیں اُٹھیں۔

یہ سن کر وہ میری والدہ کے کمرے کی طرف نہایت تشویشناک حالت میں بڑھے۔ اس وقت انہوں نے اپنا سانس روک لیا تھا اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولنے لگے۔ مگر وہ بند تھا۔ اس لئے انہیں دوسرے دروازے سے اندر جانا پڑا۔ ہم بھی اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہر چیز پر حسرت برس رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ناتالیا ساوشنا نے زار زار رونا شروع کر دیا۔ ہمارے آنے سے پہلے وہاں بالکل خاموشی تھی۔ مگر ہم کو دیکھتے ہی سب نے چلانا شروع کر دیا۔

اماں جان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر انہیں دکھائی کچھ نہیں دیتا تھا . . . . اُف میں اس خوفناک منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ہم سب کو باہر نکال دیا گیا۔ بعد میں اس نے اپنی والدہ کے آخری لمحات کے متعلق ناتالیا ساوشنا سے دریافت کیا۔ اور اس نے بیان کیا۔ کہ جب انہوں نے تمہیں باہر بھیج دیا۔ تو وہ

بہت عرصہ تک تڑپتی رہیں۔ گویا کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے
پھر ان کا سر تکیہ سے نیچے گر گیا۔ اور وہ ایسی خاموشی اور آرام
سے سو گئیں۔ گویا وہ آسمانی فرشتہ تھیں۔ اور آخری وقت
ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ اے ہمارے مالک۔ میرے بچو!
. . . . . . پھر انہوں نے ہاتھ اٹھائے۔ شاید وہ تمہارے
لئے دعا مانگ رہی تھیں۔ مگر خدا نے اس کی قسمت میں یہی لکھا
تھا کہ وہ تمہیں آخری وقت میں نہ دیکھ سکیں۔

غم

شام کے وقت مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ میں اپنی
والدہ کو ایک بار پھر دیکھوں۔ چنانچہ میں نہایت خاموشی
سے اس کمرہ میں داخل ہو گیا۔

کمرے کے وسط میں ایک میز کے اُوپر وہ صندوق
رکھا تھا۔ جس میں میری والدہ کی لاش تھی۔ اس کے
گرد شمعدان میں شمعیں جل رہی تھیں۔ اور دور ایک کونے
میں پادری دعائیں پڑھ رہا تھا۔

میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر

رونے سے میری آنکھیں اس قدر سوج گئی تھیں۔ اور پپوٹے اس
قدر کھنچ گئے تھے کہ میں کسی چیز کو دیکھ نہ سکا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا
کہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئی ہیں۔ میں اس
کا چہرہ دیکھنے کے لئے کرسی پر کھڑا ہو گیا۔ مگر مجھے دھندلی سی
چیز دکھائی دی۔ جب میں نے غور سے نظر جما کر دیکھا۔ تو میں
اس کے مانوس اور پیارے چہرے کو پہچان سکا۔ میں یہ دیکھ
کر کانپ اٹھا۔ کہ یہ وہی ہے۔ اس کی آنکھیں اندر دھس گئی
تھیں۔ اس کا چہرہ بالکل سرد اور سخت ہو گیا تھا۔

میری آنکھیں اس پر جم گئیں اور میرے خیالات میں ان
خوشی کے ایام کی تصویر پھر گئی۔ اور میں تصور میں زندہ اور
خوش باش سمجھنے لگا۔ میری آنکھیں اس کے زرد چہرہ پر جمی
ہوئی تھیں۔ مجھے وہ ناخوشگوار حقیقت پھر یاد آ گئی
اور میں کانپ اٹھا۔

پھر تصورات نے اصلیت کی جگہ لے لی۔ اور پھر اصلیت
کا احساس ان تصورات کو تباہ کر دیتا تھا۔ آخر میرا تخیل تھک
گیا۔ اور اس نے مجھے دھوکا دینا چھوڑ دیا۔ اصلیت کا احساس
بھی غائب ہو گیا۔ اور میں بیہوش ہو گیا۔ میں نہیں جانتا۔ کہ

یہ کیا حالت تھی۔ اور میں کب تک اپنی ہستی سے بے خبر رہا اور اس بلند اور ناقابل بیان مسرت انگیز اور افسردہ خوشی میں کھویا رہا۔

ممکن ہے کہ جب وہ بہتر دنیا کی طرف پرواز کر گئی تھی۔ اور اس کی پیاری روح ہمیں اس حالت میں دیکھنے کے لئے آئی ہو۔ جس میں کہ وہ ہمیں چھوڑ گئی تھی۔ اور اس نے آکر میرے غم کو دیکھا ہو۔ اُسے رحم آگیا ہو اور وہ زمین پہ مجھے تسکین اور خوشی دینے کے لئے اتر آئی ہو۔

میں اسی حالت میں کھڑا تھا۔ کہ ایک اور پادری اندر آیا۔ میں نے سوچا کہ وہ خیال کریگا۔ کہ یہ کیسا سنگدل آدمی ہے۔ بس یہ خیال آتے ہی میں دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

اب جب مجھے وہ لمحات یاد آتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ خود فراموشی کی حالت ہی صحیح غم تھا۔ دفن ہونے سے پہلے اور بعد تک میں چلاتا رہا۔ مگر مجھے شرم آتی ہے۔ جب مجھے یہ خیال آتا ہے۔ کہ اس میں خود غرضی کے جذبات شامل تھے کیونکہ میں یہ جتانا چاہتا تھا۔ کہ میں سب سے زیادہ غمزدہ ہوں اور دوسروں پہ اس کا اثر ڈالنا چاہتا تھا۔

تمام گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا تھا
لوگ آکر ابا جان کو تسکین دیتے تھے۔ اور ہمارے متعلق افسوس
سے کہتے تھے۔ کہ بیچارے یتیم رہ گئے ہیں۔
دُور کونے میں ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی تھی۔ اور خدا سے
دعا مانگتی تھی کہ مجھے بھی اسی کے پاس پہنچا دے۔ جس کو میں دنیا
میں سب سے زیادہ محبت کرتی۔ اور اس کو یقین تھا۔ کہ
عنقریب ایسا ہو جائے گا۔
میں کمرے سے باہر جانے والا تھا۔ کہ کسان عورت کی
پانچ سالہ لڑکی نے اس زور سے چیخ ماری۔ کہ میں حیران
ہو گیا۔ لڑکی نے اپنی نظر اس مردہ چہرہ کی طرف جمائی ہوئی
تھی۔ اور خوف سے چلا رہی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا
کہ وہ خوبصورت چہرہ جسے میں سب سے زیادہ محبت
کیا کرتا تھا۔ خوف و ہراس بھی پیدا کرسکتا ہے۔ یہ ایک
تلخ سچائی تھی۔ جس کا اظہار پہلی دفعہ ہوا۔ اور جس نے میری
روح کو مایوسی سے بھر دیا۔

گذشتہ افسوسناک یادگاریں

امی جان اب دنیا میں نہیں تھیں۔ مگر ہماری زندگی کا لائحہ عمل وہی تھا۔ ہم اسی کمرے میں سوتے تھے۔ اور حسب معمول اسی وقت بستر سے اٹھتے اور اسی وقت جاکر سوتے تھے۔ اسی طرح صبح کی چائے پیتے تھے۔ اور انہی اوقات پر کھانا کھاتے تھے۔ سب کچھ معین وقت پر ہوتا تھا۔ کرسی میز اسی جگہ پر ترتیب سے پڑی تھیں۔ گھر کا یا زندگی کا کوئی طریق تبدیل نہیں ہوا تھا — صرف وہی موجود نہیں تھی۔

ان مسلسل تکالیف اور بے قراری سے مجھے اس قدر کوفت ہو گئی۔ کہ مجھے سخت نیند آنے لگی۔ میں نانا سا وشنا کے کمرے میں گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ سو رہی ہے۔ مگر میری آہٹ سن کر وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ اس نے اندازہ لگایا۔ کیا میں سونا چاہتا ہوں۔ اس لئے وہ اٹھ بیٹھی۔ اور کہا آؤ۔ سو رہو۔ ذرا آرام کر لو۔

میں نے جواب دیا۔ تم بھی تھکی ہوئی ہو۔ تم ہی سو رہو۔

اس نے جواب دیا۔ پیارے میں آرام کر چکی ہوں۔ علاوہ

انہیں یہ سونے کا وقت بھی نہیں ہے۔

میں نے اس سے سوال کیا۔ کیا اس حادثے کی توقع ہو سکتی تھی؛

وہ میرے اس سوال سے کچھ حیران ہو گئی۔ اور کہا۔ کہ یہ کسے امید ہو سکتی تھی۔ میں سب سے بڑی تھی۔ مجھ سے کتنے چھوٹے افراد تو فوت ہو گئے۔ اور میں انہیں قبر میں اتار کر آئی۔ اور اب میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اس کے بعد بھی زندہ ہوں۔ یہ خدا کی مرضی ہے۔ اس نے اس کو اٹھا لیا ہے۔ وہ اسی قابل تھی۔ کیونکہ اچھوں کی وہاں بھی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بتایا۔ کہ اس کی روح اب بھی یہیں ہے۔ اور ہماری سب باتوں کو سن رہی ہے اور ہمیں دیکھ رہی ہے۔

یہ کہتے کہتے وہ رونے لگ گئی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔" اس صدمہ سے خدا نے مجھے کئی قدم اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ اب میرے لئے کیا باقی رہ گیا ہے؛ مجھے کس لئے زندہ رہنا ہے۔ کس کو محبت کروں؛

ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے روتے رہے۔ اور نیند کا خیال بھی نہ رہا۔

تجہیز و تکفین کے تین دن بعد ہم ماسکو روانہ ہو گئے۔ ہمارے پہنچنے پر دادی اماں نے والدہ کی موت کی خبر سنی۔ تو اسے نہایت سخت صدمہ ہوا۔ ایک ہفتہ تک وہ یوں بدحواس اور خاموش رہی گویا وہ گونگی ہے۔ ہمیں فکر ہو گئی۔ کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ اس کی آنکھیں بالکل کھلی رہتیں۔ اور وہ ایک ہی جگہ پر نظر جمائے رہتی۔

ایک دن اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نہایت غمناک آواز میں کہا۔ پیارے۔ میرے فرشتے۔ میرے پاس آؤ۔ میں نے خیال کیا۔ کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے میری والدہ کی شکل پھر رہی تھی۔

غم کی وجہ سے اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد اس نے اچانک رونا شروع کیا۔ اس سے اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ پھر اس نے ہمیں اپنے پاس بلایا۔ والدہ مرحومہ کا ذکر کیا۔ اور ہمیں تسلیاں دیں۔ میری والدہ کی موت کے ساتھ ہی میرے بچپن کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اور میری زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہو گیا۔ . . . یعنی لڑکپن

لڑکپن

شہر کو روانگی

ہم گاڑی پر سوار ہو کر ماسکو روانہ ہوئے۔ میں قطعاً اُداس نہ تھا۔ میرے دماغ میں گذشتہ واقعات کی کوئی یاد نہ تھی۔ بلکہ آیندہ کے لئے ایک تڑپ تھی۔ ہم جس قدر آگے بڑھتے جاتے۔ اسی قدر پچھلے غمناک واقعات بھولتے جاتے تھے۔ اور تازہ اُمنگیں اور نئی نئی امیدیں ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ راستے کا خوشگوار منظر میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ موسم بہار میری روح میں حال کے اطمینان بخش اور مستقبل کی امیدوں سے لبریز جذبات ابھار رہا تھا۔ کوئل درختوں پر کوکو کی رٹ لگا رہی تھی۔ اور پھولوں کی نسیم سحری سے ملی جلی خوشبو طبیعت کو معطر کر رہی تھی۔

سرائے میں مجھے عبادت کا کوئی موقع نہ ملا تھا۔ میرا تجربہ ہے۔ کہ جس دن میں عبادت سے غافل ہو جاتا۔ اسی دن ضرور کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آتا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور عبادت میں مشغول ہو گیا۔ مگر منظر کی دلفریبی میری توجہ کو اپنی طرف راغب کر رہی تھی۔

سامنے سڑک پر کچھ راہبہ عورتیں ان کو دیکھ کر دل میں اس قسم

کے خیالات پیدا ہوئے ۔ یہ کہاں جارہی تھیں، اور کیوں جارہی ہیں ۔ کیا یہ کسی دور دراز سفر پہ جارہی ہیں ؟ وہ قافلہ نہایت سرعت سے ہمارے سامنے سے گذر گیا ۔ میں اگلے پڑاؤ کا نہایت بے تابی سے انتظار کرتا ۔ اور ہر وقت یہی سوچتا رہتا ۔ کہ اب اتنا سفر طے کرنا باقی رہ گیا ہے ۔

راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا ۔ جہاں ہمیں ناشتہ کرنا تھا ۔ اور وہیں ذرا سستانا تھا ۔ سڑک کے دونو طرف چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دکھائی دیتے تھے ۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے ۔ گاؤں کے لڑکے ننگے پاؤں ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے ۔ فلپ انہیں گھورتا ۔ مگر وہ باز نہ آتے ۔

شام کے قریب جب سورج مغرب میں اپنا منہ چھپا رہا تھا ۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے ۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ آندھی کے ایک نہایت سخت طوفان نے ہمیں آلیا ۔ ہمارا سامان اور ہمارے چہرے گرد سے اٹ گئے ۔ بجلی کی چمک سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی ۔ وہ اس زور سے کڑکتی ۔ کہ مارے خوف کے ہمارا کلیجہ دھک سے رہ جاتا ۔ آندھی کے زور سے درخت جڑھ سے اکھڑ گئے ۔ خطرہ اور خوف سے ہم سہم گئے ۔ اور اگر

آدھ گھنٹہ تک یہی حالت رہتی۔ تو مجھے یقین ہے۔ کہ میں دم گھٹ کر مر جاتا۔ بس معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بارش شروع ہوئی۔ اور ہمیں اس مصیبت سے نجات ملی۔

جب ہم ماسکو پہنچے۔ تو دادی اماں کے کہنے پر والد بزرگوار نے کارل ایوانا یچ سے کہہ دیا۔ کہ اب ہم لڑکوں کے لئے کوئی نیا اتالیق مقرر کریں گے۔ اس لئے آپ اپنا انتظام کر لیجئے۔ کارل نا یچ نے مجھے اپنی داستان سنائی۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ کہاں تک درست ہے۔ یہ بالکل انوکھی سی داستان تھی۔ بس الف لیلیٰ کا قصہ سمجھئے۔

مجھے قدرتاً نو اریچ سے نفرت تھی۔ ہمارا اتالیق تو اریچ مجھ سے ہمیشہ خفا رہتا۔ والودیا ہمیشہ اپنا سبق یاد کر کے سنا دیتا۔ مگر میں گونگوں کی طرح خاموش کھڑا رہتا۔ آج جب معمول وہ کمرے میں داخل ہوا۔ والودیا نے اپنا سبق فرفر سنا دیا۔ اس لئے اس کے نام کے سامنے عمدہ لکھا گیا۔ جب میری باری آئی۔ تو میں کچھ بھی نہ سنا سکا۔ وہ سخت برہم ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ میں مفت کی تنخواہ نہیں لینا چاہتا

اور اپنی کاپی میں میرے متعلق لکھا۔ کہ یاد نہیں کیا۔ اس نے میری
ان نگاہوں کا بھی خیال نہیں کیا۔ جن سے طلب رحم اور مایوسی
کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
اس کے لئے تو فقط ایک جنبش قلم ہی تھی۔ مگر میرے لئے
انتہائے بدقسمتی۔

جب ہم نیچے پہنچے۔ تو کھانا کھا کر "بلی چوہا" کھیلنے کے لئے
دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کھیلتے کھیلتے میں ایک کونہ کی طرف
گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ سرپرہا نے سونیا کے منہ پر بوسہ دیا۔
میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ آہ دغا باز!

اس حادثہ سے مجھے جنس لطیف سے سخت نفرت ہو گئی
اور میرے دل میں طرح طرح کے خیال گزرنے لگے۔ ابھی میں
دنیا کی اس بے رخی پر طرح طرح کی خیال آرائیاں کر رہا تھا۔
کہ سینٹ جرام (ہمارا اتالیق) کمرے میں داخل ہوا۔ اور مجھ
سے کہنے لگا۔ کہ تمہیں آج کھیلنے کا کوئی حق نہیں۔ اوپر چلے جاؤ
میں نے تم سے کئی دفعہ کہا تھا۔ کہ اگر تمہاری یہی حالت رہی
تو تمہیں ضرور سزا دوں گا۔ مگر تمہاری دادی اماں نے تمہیں ہمیشہ
چھڑا دیا۔ لیکن اب میں نے دیکھ لیا ہے۔ کہ تم صرف چھڑی سے

درست ہو سکتے ہو۔ اور آج تم پوری طرح سے اس کے مستحق ہو۔ آخر اس نے میرا بازو پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح مجھے لے جا کر دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔

تخیلات

جب مجھے اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تو میں نے اپنے قصور کو یاد کیا۔ اور میں یہ اندازہ لگا سکا۔ کہ مجھ پر اب کیسی سخت مصیبت پڑے گی۔ میرے اردگرد بالکل خاموشی تھی۔ مگر نیچے کے کمرے سے طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کہیں سینٹ جیرام بلند آواز میں میرے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ کہیں بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر کسی کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ میں اندھیرے کمرے میں بند ہوں۔ اگرچہ چیخ پکار نہ کی۔ مگر میرے دل پر ایک بوجھ سا اور میرے آوارہ تصور میں طرح طرح کے خیالات نہایت تیزی کے ساتھ چکر لگا رہے تھے۔ میں اس خیال میں کھو گیا۔ کہ میری قسمت کیسے کیسے غم اور کتنی ناامیدیاں لکھی گئی ہیں۔

پھر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس نفرت کی

کوئی نامعلوم وجہ ضرور ہے۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ دادی اماں سے لے کر کوچبان تک مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور میری تکالیف سے حظ اٹھاتے ہیں، اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ میں اپنے والدین کا بیٹا نہیں۔ اور نہ ہی والودیا کا بھائی ہوں۔ بلکہ ایک یتیم ہوں۔ اور سخاوت کے طور پر میری پرورش کی گئی ہے۔ اس فضول خیال سے مجھے کچھ افسردہ سی تسکین ہو گئی۔ یہ خیال کہ میرے غم کی وجہ میرا قصور نہیں۔ بلکہ میری شومئ قسمت ہے۔ اور یہ بالکل کارل ایوانا بچ کی بدقسمتی سے مشابہ ہے۔ مجھے کچھ آرام دہ معلوم ہوتا۔

میں نے اپنے تئیں کہا۔ کہ کل میں ابا کے پاس جاؤں گا۔ اور اس سے کہوں گا۔ کہ اب میری پیدائش کا راز مجھ سے چھپانا فضول ہے۔ اس وقت وہ جواب دیں گے۔ کہ میں نے تمہیں پرورش کیا ہے۔ اگر تم میری محبت کے قابل ہوگے۔ تو میں تمہیں نہ چھوڑوں گا۔ مگر میں اس کو جواب دونگا کہ ابا! اگرچہ میں تمہیں کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ مگر میں آخری دفعہ یہ استعمال کرتا ہوں۔ میں نے ابا سے ہمیشہ محبت کی ہے۔ اور آئندہ بھی محبت کرتا رہونگا۔ اور کبھی نہ بھولوں گا۔ کہ تم میرے خیر اندیش رہے ہو۔ مگر اب میں اس گھر

میں نہیں رہ سکتا۔ اب یہاں مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ اور سینٹ جیرام نے مجھے تباہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ یا وہ اس گھر کو چھوڑ دے گا۔ یا میں۔ میں یقیناً اس کو قتل کر دوں گا۔ اور اس بدائی کے خیال سے سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ مگر مجھے اس ستمناک سرا کا خیال آیا۔ جو میری منتظر تھی حقیقت نے اپنے آپ کو صحیح حالت میں پیش کر دیا۔ اور میرے تخیلات بالکل غائب ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو بالکل آزاد تصور کرنے لگا۔ میں وطن کی خاطر لڑائی پر روانہ ہو گیا ہوں اور وہاں میں نے اپنی بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ آخیر میں زخموں سے چُور ہو گیا ہوں۔ بعد میں جرنیل بنا دیا گیا ہوں۔ اب بادشاہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ اور میں اس سے کہتا ہوں۔ بس مجھے سینٹ جیرام سے اپنا بدلہ لے لینے دیجئے۔ میں اسے تباہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس حالت میں مجھے خیال آتا ہے۔ کہ اصلی سینٹ جیرام ابھی چھڑی لے کر آجائے گا۔ پھر میں اپنے آپ کو جرنیل کی بجائے وہی بدبخت اور قابل رحم ہستی پاتا ہوں۔

پھر میرے دل میں خدا کا خیال آتا ہے۔ میں اس سے دریافت کرتا ہوں۔ کہ وہ کیوں مجھے اس قدر سزا دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ میں نے عبادت سے غفلت نہیں کی۔ پھر مجھے کیوں تکلیف

اُٹھا رہا ہوں۔ خدا کی بے انصافی کا خیال میرے دل میں تمام اُن
جڑاعیں پکڑ تا گیا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو مُردہ تصور کیا۔ اور دیکھا۔ کہ سینٹ جیرام
میری بجائے میری لاش کو دیکھ کر حیران ہو کر تک رہا ہے۔
سب کو میری موت پر سخت افسوس ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ
کہ کیا ہی اچھا لڑکا تھا۔ اور سینٹ جیرام کو دھکاتے ہیں اور کہتے ہیں۔
دُور ہو جاؤ۔ بدمعاش تم ہی اِس کی موت کے موجب ہو۔
سینٹ جیرام اِن کے قدموں پر گر کر معافی مانگ رہا ہے۔
چالیس دن کے بعد میری رُوح آسمان کی طرف پرواز کر
جاتی ہے۔ اور وہاں میں اپنی جان کی رُوح سے ملتا ہوں۔ وہ مجھ سے
پیار کرتی ہیں۔ اور ہم اپنی پرواز کو اور بلند کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُس
وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں جاگ اٹھا ہوں
اور اپنے آپ کو اسی ٹرنک پر بیٹھا ہوا پاتا ہوں۔

اباجان

جب سے دالو وبا یونیورسٹی میں داخل ہوا ہے۔ اباجان خاص طور پر ہشاش بشاش رہتے ہیں۔ اور معمول سے زیادہ مرتبہ دادی اماں کے ساتھ کھانا تناول کرنے آتے ہیں۔ مجھے نکولے سے اس خوشی کی وجہ یہ معلوم ہوئی ہے۔ کہ آپ نے جوئے میں اچھی خاصی رقم جیتی ہے۔ بعض اوقات تو یہاں تک نوبت آجاتی ہے کہ آپ شام کو کلب جانے سے پیشتر ہمارے پاس آتے ہیں۔ پیانو کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ہمیں اپنے اردگرد جمع کر لیتے ہیں۔ اور بغیر ایڑیوں کے نرم بوٹ کو فرش پر مار مار کر گیت گاتے ہیں۔ پھر ننھی پیاری لوبیا جسے آپ سے بیحد الفت ہے۔ آپ کے گلے سے چمٹ جاتی ہے۔ بعض اوقات آپ ہماری جماعت میں چلے آتے ہیں۔ اور سنجیدہ صورت بنائے میرا سبق سنتے ہیں لیکن میری جو چند غلطیاں نکالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو میرا سبق اچھی طرح نہیں آتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ دادی اماں ہر شخص کو بے وجہ اور بے قصور ناراض ہوتیں۔ اور ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ تو آپ ہمیں نظر بچا کر آنکھ سے

اشارے سے بلا لیتے ہیں۔ میں بچپن سے آپ کو بڑا بزرگ اور قابلِ تعظیم
سمجھتا تھا۔ لیکن اب تو وہ آہستہ آہستہ میری نظروں سے گر گئے ہیں۔ میں
آپ کے لمبے لمبے سفید ہاتھوں کو محبت اور عزت کے جذبات کے ساتھ
بوسے دیتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں آپ کے متعلق سوچ میں پڑ
جاتا ہوں۔ اور آپ کی باتوں پر نکتہ چینی کرتا ہوں۔ اور اُن کے متعلق
ایسے خیالات بھی میرے سر میں سما جاتے ہیں۔ جن کا وجود مجھے خوف زدہ
کر دیتا ہے۔ مجھے وہ موقع کبھی نہیں بھولے گا۔ جب مجھے ایسے خیالات
آئے۔ جن سے مجھے اخلاقی تکلیف ہوئی۔

ایک مرتبہ شام ہو گئی تھی۔ کہ آپ سیاہ کوٹ اور سفید واسکٹ
پہنے بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور والودیا سے کہا چلو محفلِ رقص
کو چلیں۔ والودیا اپنے کمرے میں لباس پہن رہا تھا۔ اور دادی اماں اپنی
خواب گاہ میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ کہ والودیا آئے۔ اور اپنی سج دھج دکھائے
دادی اماں کی عادت سی ہو گئی تھی۔ کہ والودیا کو محفلِ رقص میں جانے سے
پیشتر ضرور بلائیں۔ اُسے بوسہ دیتیں۔ اور رقص کے متعلق ایک آدھ مشورہ
دیتیں۔ ممی اوپر کا تبا کمرۂ موسیقی میں جہاں ایک ہی لیمپ جل رہا تھا۔
ٹہل رہی تھیں۔ اور لوبیا پیانو پر اماں جان ایک نہایت محبوب راگ
الاپ رہی تھی۔

میری ہمشیرہ اماں جان سے بہت مُشابہ تھی لیکن یہ مشابہت نہ خط و خال میں پائی جاتی تھی۔ نہ شکل و صورت میں بلکہ ایک غیر مُعیّن شے میں یعنی ہاتھوں۔ چال ڈھال آواز اور خاص عادات میں۔ جب لوبیا ناراض ہوتی۔ تو کہتی وہ ایک شخص کو تمام عمر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ "تمام عمر" کے الفاظ میری اماں جان بھی بہت استعمال کرتی تھیں۔ اور میری ہمشیرہ اماں جان کی طرح "تمام عمر" تلفظ کرتی۔ ان سب سے زیادہ مُشابہت اس کے پیانو بجانے اور اس سے تعلق رکھنے والے حرکات و سکنات میں تھی۔ وہ اماں جان کی طرح لباس دُرست کرتی انہیں کی طرح بائیں ہاتھ سے اوپر کے کونے سے ورق اُلٹتی جب اس سے کوئی مشکل شعر پیانو پر نہ بجایا جاتا۔ تو اماں جان کی طرح تنگ آکر پیانو کے سُروں پر زور سے ہاتھ مارتی۔ اور کہتی۔ ہائے اللہ۔ فیلڈ کا دلفریب راگ گاتے ہوئے بھی اس کی آواز میں اماں جان کی سی نرمی پائی جاتی۔ یہ راگ ہے۔ کہ اگر ہزاروں پیانو بجانے والے ہمیں نئے نئے دلفریب راگ سنائیں۔ تو جب بھی ہم اُسے نہیں بھول سکتے۔

ابّا جان تیز قدم چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور لوبیا کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ لوبیا نے ابّا جان کو دیکھ کر راگ بند کر دیا۔

اَبّاجان نے اسے بیٹھتے ہوئے کہا۔ نہیں لوبیا تم گانی بجاتی جاؤ۔
تم جانتی ہو۔ میں تمہارے گانے کا کتنا مشتاق ہوں۔

لوبیا پیانو بجاتی رہی۔ اور اَبّاجان اس کے سامنے ہاتھ سر پر رکھے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر وہ جلدی جلدی شانے ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے جب پیانو تک پہنچتے۔ تو ٹھہر جاتے۔ لوبیا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے میں نے آپ کی چال ڈھال سے معلوم کر لیا۔ کہ آپ کی طبیعت سکون پر نہیں۔ جب آپ کئی بار اِدھر اُدھر ٹہل چکے۔ تو لوبیا کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ اُس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ اور ٹہل قدمی شروع کر دی۔ جب لوبیا گا بجا چکی۔ تو اَبّاجان کے پاس گئی۔ اور ان سے دریافت کیا کہ میں نے ٹھیک طور پر گایا ہے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ اَبّاجان۔

اَبّاجان نے خاموشی سے اس کا سر پکڑ لیا۔ اور اس کی پیشانی اور آنکھوں پر بوسہ پہ بوسہ دینے لگے۔ ان کے بوسوں میں وہ شفقت پائی جاتی تھی۔ کہ میں نے کبھی ان میں کبھی ایسی شفقت کا وجود نہیں دیکھا تھا۔

دفعتاً لوبیا کے ہاتھ سے گھڑی کی زنجیر گر پڑی۔ اس کی بڑی بڑی اور حیرت زدہ آنکھیں اَبّاجان کے چہرے پر پڑی رہیں اور

چلاّ کہنے لگی۔ او خدایا! آپ رو رہے ہیں۔ پیارے ابا معاف کیجیے۔ میں بھول گئی تھی۔ کہ ابّا جان کا پیارا گیت ہے۔

ابّا جان نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔ نہیں پیاری تم یہ گیت اکثر گایا کرو۔ کاش تم جانتیں۔ تمہارے ساتھ رونے سے مجھے کتنا فائدہ ہو جاتا ہے۔

ابّا جان نے لوسیا کو پھر بوسہ دیا۔ اور اپنے ہیجان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے شانے ہلاتے اِس دروازے سے باہر نکل گئے۔ جو والودیل کے کمرے کی طرف کھلتا تھا۔

آپ نصف راستہ طے کر کے ٹھہر گئے۔ اور بآوازِ بلند کہا ولڈیمر کیا تم جلدی تیار ہو جاؤ گے؟ عین اس وقت ہماری خادمہ شلما رو رہی تھی۔ وہ ابا جان کو وہاں کھڑے دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اور آنکھیں میچے کئے چکر کاٹ کر جانا چاہتی تھی۔ کہ ابّا جان نے اس کو ٹھہرا لیا۔

شاما کا چہرا شرم سے سُرخ ہو گیا۔ اور اس نے اپنا سر پہلے سے زیادہ جھکا لیا۔ اُس نے نہایت دھیمی آواز سے کہا۔ اجازت دیجئے۔

جب شاما چلی گئی۔ اور ابا جان نے مجھے دیکھا۔ تو اُنہوں نے

شانے ہلاتے اور کھانستے ہوئے کہا۔ ولڈیر نہیں ویرنٹو نہ ہو گی ۔
مجھے ابا جان سے محبت ہے۔ لیکن انسان کا دل و دماغ اس سے
بے نیاز ہوتا ہے۔ اور اکثر اس میں ایسے خیالات سما جاتے ہیں۔
جن سے اُس کے جذبات مجروح ہوتے ہیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتا
اور وہ اُسے ستاتے ہیں۔ اگرچہ میں خود ایسے خیالات سے بچنے کی
کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہ پھر بھی دل میں سما ہی جاتی ہیں ۔

دادی اماں

دادی اماں روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہیں۔ ان کے کمرے سے
اکثر گھنٹی بجنے انکاشا کے بڑبڑانے اور دروازوں کے بند ہونے
یا کھلنے کی آوازیں آتی ہیں۔ اب وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں طلب کرنے
کی بجائے اپنی خوابگاہ میں بلاتی ہیں۔ جب میں ان کو سلام
کرتا ہوں۔ تو دیکھتا ہوں کہ ان کے ہاتھ بالکل زرد ہیں۔ اور ان کے
کمرے سے وہی ناگوار بو آتی ہے۔ جو پانچ سال گذرے۔ اماں جان
کے کمرے سے آئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ان کو دن میں تین تین بار دیکھنے
آتے ہیں۔ کئی بار طبی مشورے ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے

باوجود دادی اماں گھر کے ہر آدمی اور بالخصوص ابا جان سے اسی اخلاق غرور اور تکلف سے ملتی ہیں۔ وہ اب بھی بڑا کھینچ کھینچ کر لفظ منہ سے نکالتی ہیں۔ اور ماتھے پر بل لا کر کہتی ہے اوپیارے۔

کئی دن گذر گئے ہیں ہمیں اُن سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی ایک صبح ہمارا سبق پڑھنے کا وقت تھا۔ کہ سینٹ جیرام نے مجھ سے کہا جاؤ تم لوبیا اور کٹیا کے ساتھ جا کر سیر کر آؤ۔ جب میں برف پہ چلنے والی گاڑی پر بیٹھنے کو تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ دادی اماں کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے بھوسہ رکھا گیا۔ اور پُر اسرار آدمی نیلے رنگ کے لبادے پہنے ہمارے مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے ہیں۔ مجھے یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ کہ وہ ہمیں ایسے غیر معمولی موقع پر کیوں باہر بھیج رہے ہیں۔ اس روز سیر کرتے ہوئے میں اور لوبیا خوشی سے اچھل رہے تھے معمولی سے واقع اور معمولی سی حرکت پر بے ساختہ قہقہے مارنے لگے۔

ایک پھیری والا اپنی چھابڑی سنبھالے تیزی سے سڑک عبور کرتا ہے۔ تو ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ ایک غریب گاڑیبان گھوڑا دوڑا کر ہم سے آگے نکل جاتا ہے۔ تو ہم مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ ہمارے گاڑیبان فلپ کا جھانسا گاڑی کے پیچھے ہیں

ہنس جاتا ہے۔ اور وہ ہم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ کیا واہیات حرکت ہے۔ یہ سن کر ہم ہنستے ہنستے لب مرگ ہو جاتے۔ ممی ہماری بے وجہ ہنسی سے ناخوش ہوتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ بیوقوف ہی بے وجہ ہنسا کرتے ہیں۔ اس کے یہ لفظ سنکر لوبیا ہنسنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ ہنسی ضبط کر لیتی ہے۔ جس سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ کن آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہے۔ ہماری آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ اور ہم ہو مر کی طرح اس قدر کھل کھلا کر ہنستے ہیں۔ کہ ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ اور شدت خندہ سے ہمارا گلا گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہماری ہنسی ضبط نہیں ہوتی۔ ادھر ہم ذرا خاموش ہوئے۔ کہ بہن نے پھر ایک خاص لفظ کہہ دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم نقصوں پر قہقہے مارنے لگتے۔

گھر پہنچکر میں لوبیا سے کوئی مضحکہ انگیز لفظ کہنے کو تھا۔ کہ میری نگاہ تابوت کے سیاہ ڈھکنے پر پڑی۔ یہ ڈھکنا ہماری ڈیوڑھی کے دروازے سے لگاکر کھڑا کیا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سینٹ جیرام نے ہمارا استقبال کرتے ہوئے کہا آپ کی دلوی اماں رحلت فرما گئیں۔ سینٹ جیرام کا چہرہ شدت غم سے

زرد ہو رہا تھا۔ جب تک دادی اماں کی لاش گھر میں رہی۔ مجھے موت کے خیال نے خوف زدہ رکھا۔ اور میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ مجھے بھی ایک روز مرنا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی میرا جی بھاری ہو جاتا ہے۔ مجھے دادی کے مرنے کا افسوس نہ تھا۔ اور شاید کسی کو بھی نہ تھا۔ اگرچہ مکان میں ماتم پرسی کرنے والوں کا اژدہام ہے لیکن کسی شخص کو مرنے والی کا افسوس نہیں۔ ہاں ایک ہستی ہے۔ جس کی آہ و بکا سے جگر گداز ہو رہا ہے۔ یہ دادی اماں کی خادمہ گاشا ہے۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اور اس کے دروازے بند کر کے جی کھول روتی ہے۔ بال نوچتی ہے۔ اپنے آپ کو بددعائیں دیتی ہے۔ اور کسی کے تسلی آمیز الفاظ اور نصیحت نہیں سنتی۔ اور بار بار کہتی ہے۔ اب مجھے موت ہی سکون دے سکتی ہے۔ ایسی ہی باتیں صدق دلی کی علامتیں ہوا کرتی ہیں۔

دادی اماں نہیں ہم میں لیکن ان کا ذکر ہماری محفل میں ہے۔ گھر میں بالعموم اس وصیت نامے کا ذکر رہتا ہے۔ جو دادی اماں نے مرتے وقت لکھا تھا۔ اور جس کا علم بجز مختار کار کے کسی کو نہیں ہے۔ ہمارے دل میں یہ مسرت انگیز خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہمیں دادی اماں کی جائداد ملنے والی ہے۔ لیکن چھ ہفتے بعد نکوے جو اِدھر اُدھر کی خبریں لانے

میں بہت مشتاق ہے ہمیں بتاتا ہے۔ کہ دادی اماں نے اپنی تمام جائداد لوبیا کے نام وصیت کردی ہے۔ اور اس کی سرپرستی کا بار ابا جان کی بجائے ایوالونچ کے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔

یونیورسٹی

اب میرے یونیورسٹی میں داخل ہونے میں چند ماہ رہ گئے ہیں میں دل لگا کر سبق یاد کرتا ہوں۔ اور نہ صرف اپنے استادوں کا بڑی بے خوفی سے انتظار کرتا ہوں۔ بلکہ مجھے سبق پڑھنے میں ایک گونہ مسرت ہوتی ہے۔

مجھے سبق بار بار پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے میں ریاضی کی تیاری کر رہا ہوں میں نے یہ مضمون صرف اس لئے منتخب کیا ہے۔ کہ اس کی علامتیں اور اعداد وغیرہ میرے دل کو بھاتے ہیں۔

میں والودیا کے برابر لمبا نہیں ہوں۔ البتہ شانے خوب بھرے ہوئے ہیں۔ اور چھاتی خوب کشادہ ہے۔ لیکن میرے حسن میں کوئی ملاحت نہیں۔ وہی سادہ صورت ہے۔ اور مجھے بالعموم اس سے صدمہ ہوتا ہے میں ریاکاری سے بچنا اور سادگی کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہوں۔ صرف

اس ایک بات سے میرا دل مطمئن ہے کہ ابا جان نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ کہ تم بڑے ہوشیار لڑکے ہو میں نے ان کی بات کو صحیح سمجھا۔

سینٹ جیرام میرے شغف علمی سے بالکل مطمئن ہیں۔ اور میری تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اور مجھے نہ صرف ان سے محبت ہے۔ بلکہ جب وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ تمہاری جیسی عقل اور سمجھ کا آدمی یہ کام نہ کر سکے تو نہایت شرم کی بات ہے۔ تو مجھے ان سے اور بھی الفت ہو جاتی ہے۔

اب مجھے دروازے کے پیچھے چھپنے پر شرم معلوم ہوتی ہے۔ میرے لئے یہ امر نہایت مسرت خیز ہے کہ ماشا اور ویلی میں بہت الفت ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشی کا مقام یہ ہے۔ کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی ہے۔ اور میں بھی ابا جان کی اجازت سے ان کی رسم کتخدائی میں شریک ہوا ہوں۔

یہ نیا جوڑا ایک تھالی میں مٹھائیاں رکھے ہوئے ابا جان کے پاس آیا۔ ماشا نے بڑی شرم وحیا کے ساتھ ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور ہمارے شانوں کو بوسہ دیا۔ مجھے اس کے بوسہ سے ذرا بھی ہیجان پیدا نہ ہوا۔

مختصر یہ کہ اب میری بچپن کی خامیاں درست ہو رہی ہیں۔ ہاں ایک عیب اب بھی ہے یعنی فلسفیانہ استغراق۔

والودیا کے دوست

اگرچہ والودیا کے دوستوں کے سامنے میں بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اور اس سے میرے شیشۂ غرور کو چوٹ لگتی تھی۔ تاہم میں اس کے کمرے میں بیٹھتا۔ اس کے دوست کی گپیں بڑے شوق سے سنتا۔

ایچٹن ڈبکو اور پرنس نیحلیوڈیو اوروں سے زیادہ اس کے ملنے والوں میں سے تھے۔ ڈبکو پستہ قد اور سیاہ فام شخص تھا۔ اس کی جوانی بھی ڈھل چکی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن ان کے باوجود وہ بدصورت نہ تھا اور ہمیشہ خوش رہتا۔ وہ ان محدودے چند افراد میں تھا۔ جو محض اپنے نقائص کی وجہ سے جاذب نظر ہوتے ہیں۔ اور ان پر ہر شے کا اثر جلدی پڑ جاتا ہے۔ ایسے اشخاص بہت خوش اعتقاد ہوتے ہیں۔ ذرا کسی نے اُن کی تعریف کی پھول گئے۔ اس قسم کے لوگوں کا فیصلہ یک طرفہ اور ناقص ہوا کرتا ہے لیکن ان کے فیصلے میں ریا کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ مخلصانہ طور پر۔ اس کے علاوہ ڈبکو میرے اور والودیا کے لئے دوگونہ دلچسپی کا باعث تھا۔ اس کی خوبی وضع قطع اور عمر ——— جوانی میں یہ دونوں چیزیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ میرے لئے ایک بات بڑی دلچسپ رہ گئی

وہ یہ کہ جب ڈیکو آتا۔ تو والودیا میری موجودگی میں شرمندہ ہوتا۔ کیونکہ میں بعض اوقات نہایت معصومانہ انداز سے کوئی طفلانہ حرکت کر دیتا تھا۔

نخلڈیو کوئی خوش شکل نہ تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھیں۔ تنگ ہپٹا ماتھا۔ غیر متناسب لمبی باہیں اور ٹانگیں خوبصورت شمار نہیں کئے جا سکتے۔ اس کا غیر معمولی طویل قد۔ اس کا نرم و صاف چہرہ۔ اس کے خوبصورت دانت ہی اس کی بدصورتی کی پردہ پوشی کر رہے تھے لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں اور تغیر پذیر تبسم جو کبھی سنجیدہ کبھی طفلانہ کبھی ناقابل فہم ہوتا تھا۔ اور کبھی اس کے چہرے کو مولوالعزم جوانوں کا سا چہرہ بنا دیتا تھا۔ اور یہ چیزیں ایسی نہ تھیں کہ دیکھنے والا اس کو نظر انداز کر سکتا۔

وہ ذرا ذرا سی بات پر شرمندہ ہو جاتا۔ اور چہرہ سُرخ ہو جاتا لیکن اس کی اور میری شرمساری میں بڑا فرق تھا۔ وہ شرمندہ ہوتا تو اس کے چہرے سے استقلال ٹپکتا اور ایسا معلوم ہوتا۔ کہ وہ اپنے آپ سے بہت خفا ہے۔

اگرچہ نخلڈیو ڈیکو میں بہت گہری دوستی تھی لیکن یہ بات واضح تھی کہ عجیب اتفاق سے دوست بنے ہیں۔ ہر ایک کا میلان طبع ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ والودیا اور ڈیکو سنجیدہ اور بحث وغیرہ سے سخت گھبراتے لیکن نخلڈیو اس کے برعکس اولوالعزم۔ پرجوش جوان تھا۔ اور اگرچہ اس کا بڑا مضحکہ اڑایا جاتا۔ وہ فلسفیانہ بحث میں کود پڑتا۔ والودیا اور ڈیکو بڑے اشتیاق سے اپنی مجوزہ

عورتوں کا ذکر کرتے ۔ اور وہ ایک ہی وقت میں کئی عورتوں کے عاشق ہوتے لیکن یہ عورتیں دونوں کی یکساں محبوبہ دل نواز ہوتیں ۔ اس کے برعکس جب کبھی ڈیکو نخلڈیو کی سنہری بالوں والی کا ذکر کرتا ۔ تو نخلڈیو بہت ناراض ہوتا ۔ والودیا اور ڈیکو اکثر اپنے رشتہ داروں کا مذاق اڑاتے لیکن نخلڈیو اپنی پیاری خالہ پر پھبتیاں برداشت نہ کر سکتا ۔ والودیا اور ڈیکو کھانا کھانے کے بعد گاڑی میں سیر کرتے لیکن نخلڈیو کو کبھی ساتھ نہ لیجاتے ۔ وہ اُسے "حسین دوشیزہ" کہتے ۔

پہلی ہی نظر میں شہزادہ نخلڈیو کی دو باتوں نے مجھ پر خاص اثر کیا ۔ ایک اس کی گفتگو اور دوسری اس کی صورت ۔ اگرچہ میں نے بھانپ لیا ۔ کہ اس کا اور میرا مذاق بہت حد تک ایک جیسا ہے لیکن پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا ۔ کہ وہ میرا دوست نہیں ہو سکتا ۔

مجھے اس کی تیز نگاہیں مضبوط آواز متکبرانہ انداز اور سب سے زیادہ اس کی سرد مہری پسند نہ تھی ۔ بارہا دوران گفتگو میں مجھے اس کی تردید کرنے کا خیال آیا تاکہ اسے دلائل سے زیر کرکے اس کا غرّہ رفع کردوں ۔ اور اسے بتادوں کہ اگرچہ وہ مجھ سے سرد مہری کا سلوک کرتا ہے لیکن میں پھر بھی ہوشیار ہوں ! اے کاش شرم میری سد راہ نہ ہوتی ٭

بحث و تمحیص

ایک شام کو والدویا صوفہ پر لیٹا تھا۔ اور بازو پر جھک کر ایک فرانسیسی ناول پڑھ رہا تھا۔ کہ حسبِ معمول میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے سر اٹھا کر مجھے ایک نظر دیکھا۔ اور پھر سر نیچے ڈال کر کتاب پڑھنے لگا۔ یہ حرکت تصنع سے خالی اور قدرتی تھی لیکن اس کے اِس سلوک سے میرا چہرا مارے شرم کے سُرخ ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس کی نگاہیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ کہ میں کیوں یہاں آیا۔ اِس نے محض اس لئے نظریں نیچی کر لیں۔ کہ مجھے معلوم نہ ہو۔ کہ اس کی آنکھیں کیا کہتی ہیں۔ مجھے معمولی حرکات کا بھی کوئی مطلب لے لینے کی ایک عادت تھی میں بھی والدویا کے پاس میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور ایک کتاب اُٹھالی۔ لیکن کتاب پڑھنے سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ یہ بات تو بہت بیہودہ ہے۔ کہ ہم جو روزانہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یوں ساکت و خاموش بیٹھے رہے۔ اِس لئے میں نے پوچھا۔ "کیا آپ شام کو گھر میں ہونگے؟"

"کہہ نہیں سکتا۔ کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"اجی کچھ نہیں۔"

جب میں نے دیکھا کہ سلسلہ گفتگو شروع نہیں ہوتا ۔ تو میں خاموش ہو گیا ۔ اور کتاب پڑھنے لگا ۔ یہ عجیب بات تھی ۔ کہ جب والودیا اور میں اکیلے ہوتے ۔ تو گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے ۔ لیکن اگر کوئی تیسرا شخص خواہ وہ کتنا ہی خاموش کیوں نہ ہو ۔ نمودار ہوتا تو ہمارے درمیان بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی ہمیں یہ احساس ہوتا ۔ کہ ہم ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں ۔

ہال سے ڈبکو کی آواز آئی ۔ "کیا والودیا گھر میں ہے ؟ والودیا نے اپنے پاؤں صوفے سے نیچے رکھتے ہوئے اور کتاب میز پر پھینک کر جواب دیا ۔

"جی ہاں" "نہیں ہوں"

ڈبکو اور نخلڈیو اور کوٹ اور ہیٹ لینے کمرے میں داخل ہوئے ۔

کہئے والودیا تھیٹر چلئے گا ۔

والودیا کا چہرہ شرم کے مارے سُرخ ہو گیا ۔ اور اس نے جواب دیا ۔

"نہیں صاحب مجھے فرصت نہیں"

"نہیں صاحب ضرور جائیں گے"

"لیکن میرے ٹکٹ کہاں"

آپ تھیٹر کے دروازے پر جتنے ٹکٹ چاہئے ۔ خرید لیجئے ۔

والودیا نے جان چھڑانے کے لئے جواب دیا ۔ "اچھا ذرا ٹھہریئے ۔ میں ابھی واپس آتا ہوں" یہ کہکر وہ شانے ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا ۔

میں جانتا تھا۔ کہ والودیا تھیٹر جانے کا بہت آرزومند ہے۔ لیکن وہ محض اس وجہ سے انکار کر رہا ہے۔ کہ اس کے پاس پیسہ نہیں۔ اور وہ اب جمعدار سے ۵ روپے اس شرط پر اُدھار مانگنے گیا ہے۔ کہ وہ وظیفہ ملنے پر ادا کر دے گا۔

ڈبکو نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ کہئے مدبر صاحب مزاج اچھا ہے؟ والودیا کے دوست مجھے مدبر کہتے تھے۔ کیونکہ ایک دن کھانا کھانے کے بعد دادی اماں نے ان کے سامنے میرے مستقبل کا ذکر چھیڑا۔ اور یہ کہا تھا۔ کہ والودیا تو فوج میں بھرتی ہو جائیگا لیکن میں مدبر بنوں گا۔

نخلدیو نے سوال کیا۔ "والودیا کہاں گیا ہے؟"

میں سمجھ گیا۔ کہ نخلدیو اور ڈبکو نے والودیا کے باہر جانے کا راز بھانپ لیا ہے میں نے جواب دیا: "مجھے معلوم نہیں وہ کہاں گیا ہے۔ مجھے ہنسی آنے کو تھی۔ کہ ڈبکو بول اُٹھا۔ غالباً اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نا "مدبر صاحب! میرے پاس بھی کچھ نہیں۔ کیوں ڈبکو تمہارے پاس تو کچھ ہوگا؟"

"ذرا ٹھہرئیے میں دیکھتا ہوں"

یہ کہکر ڈبکو نے اپنا بٹوہ ٹٹولا۔ یہ ہیں پانچ..... یہ بیس۔ پھر مضحکہ خیز انداز سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ اتنے میں والودیا کمرے میں داخل ہوا "کہئے تھیٹر جائے گا؟"

"نہیں تو"

تخلڈیو نے کہا۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ کیوں نہیں کہدیتے تمہارے پاس روپیہ نہیں۔ میرا ٹکٹ لے جاؤ۔"

اور تم کیا کرو گے۔

ڈبکو نے کہا "وہ اپنے چچیرے بھائی کے ہمراہ چلا جائے گا۔"

"نہیں میں بالکل نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟"

"آپ جانتے ہیں میں بکس میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔"

کیوں پسند نہیں کرتے۔

اس لیے کہ میں پسند نہیں کرتا۔ مجھے تو بکس میں بیٹھتے تکلیف ہوتی ہے۔ پھر وہی پرانی داستان! میں نہیں سمجھتا کہ آپ کیسے تکلیف محسوس کرتے ہیں جب سب کا یہی خیال ہے۔ کہ آپ بکس میں بیٹھیں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اب کیا کیا جائے۔ آپ تو کبھی شرمندہ نہ ہوئے ہونگے لیکن مجھے تو بات بات پر شرم آجاتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ شرم کے مارے سُرخ ہو گیا آپ جانتے ہیں۔ کہ اس بزدلی کا باعث کیا ہے۔ حضرت آپ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔

اس جواب سے تخلڈیو بھڑک گیا۔ اور اس نے کہا "بڑائی کیا شے ہے؟

میرے شرمیلے پن کی وجہ یہ ہے۔ کہ میں خود ستائی نہیں جانتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ میری صحبت کو بارِ خاطر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ——— ڈبکو نے واڈوبا کے کندھے پکڑ کر اس کا کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ جاؤ۔ جاؤ۔ لباس پہن لو۔ گینیٹ تمہارے آقا کپڑے مانگتے ہیں۔ نخلڈیو نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ سے اکثر...... لیکن ڈبکو نے اس کی ایک نہ سنی۔ اور گانے لگا۔

نخلڈیو نے کہا۔ اجی آپ کہاں بھاگتے ہیں۔ میں آپ کو یوں نہیں چھوڑوں گا میں ثابت کر دوں گا۔ کہ شرمیلے پن کی وجہ خود ستائی نہیں ہے۔

ضرور آپ ضرور ثابت کیجئے۔ بشرطیکہ آپ میرے ساتھ جائیں۔

"لیکن میں تو کہہ چکا ہوں۔ کہ میں نہیں جا سکتا۔"

اچھا تو یہیں ٹھہریئے۔ اور مدیر صاحب کو ہی قائل کیجئے۔ جب ہم واپس آئیں گے۔ تو وہ ہمیں سب کچھ بتا دیں گے۔

نخلڈیو نے بچوں کی سی ضد کے ساتھ کہا۔ ہاں میں ثابت کر دوں گا آپ جلد واپس تشریف لائیے۔

اس نے میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا میں مغرور ہوں۔

اس سوال سے میں بہت پریشان ہوا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد

جواب دیا۔ "میرا خیال ہے۔ کہ آپ مغرور ہیں۔ آپ ہی کیا ہر شخص مغرور ہے اور انسان کی ہر حرکت غرور و خودستائی کی مظہر ہے" یہ کہتے ہوئے میری آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا اور اس خیال سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا کہ مجھے اپنی ہوشیاری کا ثبوت بہم پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔

نخلاڈیو نے تحقیر آمیز ہنسی سے کہا۔ "تو خودستائی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"خودستائی انسان کے اس یقین کا نام ہے۔ کہ میں ہر آدمی سے بہتر اور عقلمند ہوں"

"لیکن ہر شخص کو یہ یقین کیسے ہو جاتا ہے؟"

"خیر مجھے معلوم نہیں۔ کہ ہر شخص کو کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ میں اوروں سے زیادہ عقلمند ہوں۔ میرا یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں یقین کرتا ہوں۔ کہ دنیا بھر میں مجھ سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ تمہارا بھی اپنے متعلق یہی خیال ہے"

"نہیں۔ ہرگز نہیں میں آپ کو یقین دیتا ہوں۔ کہ مجھے اکثر آدمیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ جو مجھ سے زیادہ چالاک ہوشیار اور عقلمند تھے"

میں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "ہرگز نہیں یہ ناممکن ہے" نخلاڈیو نے بڑے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے"

"بالکل میں مذاق نہیں کر رہا"

ساتھ ہی مجھے ایک خیال آگیا جو میں نے فوراً ظاہر کر دیا۔ تو میں تمہیں اس کا ثبوت بھی دونگا۔ تو ہم اوروں سے زیادہ اپنے آپ سے محبت کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو اوروں سے بہتر اور زیادہ قابل اُلفت سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اوروں کو اپنے سے بہتر خیال کرتے۔ تو ہمیں اُن سے زیادہ اُلفت ہوتی لیکن نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو جب بھی میں راستی پر ہوں" یہ کہتے ہوئے میرے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

تخلڈیو کچھ لمحے خاموش رہا۔ پھر اُس نے نہایت سادگی سے متبسم ہو کر کہا۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا۔ کہ تم اتنے ہوشیار لڑکے ہو۔ تخلڈیو کے تبسم نے میرے دل کی کلی کھولدی۔

تعریف انسان کے جذبات واحساسات پر اتنا اثر ڈالتی ہے وہ اس کے سُننے سے خود کو اپنے سے زیادہ عقلمند سمجھنے لگتا ہے۔ بس یہی حال میرا تھا۔ میں بھی اپنی تعریف سُن کر اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ عقلمند سمجھنے لگا۔ خودستائی کی باتیں چھوڑ کر ہم نے محبت والفت کے دفتر کھولے محبت کی بحث پر کئی گھنٹے صرف ہوگئے ہمارے دلائل یک طرفہ اور بے معنی سے تھے اور اگر کوئی تیسرا شخص ہماری باتیں سنتا۔ تو انہیں بیہودہ بکواس قرار دیتا لیکن ہم ان باتوں کو بڑا اہم سمجھتے تھے۔ ہماری طبیعتیں ایسی یکساں اور ہموار تھیں۔ کہ اگر ہم میں سے کوئی بحث چھیڑتا۔ تو

دوسرا اس کے لئے آگے ہی تیار معلوم ہوتا ہم یہ خیال کرنے لگے۔ کہ ہمارے پاس نہ اتنے الفاظ ہیں۔ اور نہ وقت ہے۔ کہ ہم اپنے ان خیالات وتصورات کو عیاں کریں جو ظاہر ہونے کیلئے بیتاب تھے۔

دوستی کا آغاز

اس کے بعد میرے اور نخلڈلیو کے درمیان نہایت خوشگوار تعلقات پیدا ہو گئے۔ غیروں کے سامنے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھتا لیکن جونہی ہم تنہا ہوتے۔ ہم ایک گوشہ میں بیٹھ جاتے۔ اور ادھر اُدھر کی بحث چھیڑ دیتے۔ بحث چھیڑتے ہی ہمیں تن بدن کا ہوش نہ رہتا اور ہم دُنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے۔ اور اس بات کا خیال نہ کرتے۔ کہ بحث میں کتنا وقت گذر گیا ہے۔

ہم اپنے مستقبل فنون لطیفہ۔ سرکاری ملازمتوں شادی اور بچوں کی تعلیم پر بحث کرتے اور ہمیں کبھی تھوڑے سے بھی یہ خیال نہ آتا۔ کہ یہ سب باتیں محض واہیات ہیں ہمیں یہ احساس اس لئے پیدا نہ ہوتا۔ کہ ہم جن بیہودہ باتوں پر بحث کرتے تھے۔ وہ واہیات تو تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی دلچسپ بھی۔ اور جوانی میں بھی ہم اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جوانی

میں ہماری رُوح کی ساری قوتیں مستقبل پر مرکوز ہوتی ہیں۔ اور مستقبل موہوم اُمیدوں کے بل پر ایسا خوشگوار اور دلفریب نظر آتا ہے کہ مستقبل کا خیال ہی ایک جوان آدمی کو مسرور بنا دیتا ہے میں ان فلسفیانہ مشغول پر جو ہماری گفتگو کا اہم ترین موضوع ہوتی تھیں۔ اس وقت کا منتظر رہتا تھا جب ہم تمام بحث و تمحیص کے بعد یہ محسوس کرنے لگتے تھے۔ کہ اب بحث کا کوئی موضوع نہیں رہا۔ اور نہ اب کسی طرح اپنے دلی خیالات اور جذبات ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ میں اس لمحہ کا منتظر ہوتا تھا جب ہم خیالات کی دنیا میں اتنا اُونچا اڑ جاتے۔ کہ ہمیں یہ خیال ہونے لگتا تھا۔ کہ خیالات کی دُنیا کی تمام تر کوئی انتہا نہیں اور ہمارے بازوئے تخیل اِس سے زیادہ اونچا اُڑنے کی سکت نہیں رکھتے۔

ایک مرتبہ ہمارے شہر میں کارنیوال آیا ہوا تھا۔ نحلدؔ جو مختلف تفریحات میں اتنا محو تھا۔ کہ جہاں وہ دن میں کئی کئی بار مجھ سے ملنے آتا۔ اس روز اس نے مجھ سے بات تک نہ کی۔ یہ دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا۔ اور اس اُسے پھر ویسا ہی متکبر اور بار خاطر دوست سمجھنے لگا۔ اب میں موقع کا منتظر تھا کہ میں اُسے دکھاؤں کہ مجھے اس کی صحبت کا اِتنا خیال نہیں۔ اور نہ اس سے کوئی خاص اُنس ہے۔

جب کارنیوال ختم ہوا۔ تو وہ مجھ سے گفتگو کے لئے آیا۔ میں نے

اس سے کہدیا۔ کہ مجھے سبق یاد کرنا ہے۔ میں یہ کہہ کر بالائی منزل میں چلا گیا۔ لیکن پندرہ منٹ بھی نہ گذرے تھے۔ کہ میرے مطالعہ کے کمرہ کا دروازہ کھلا۔ اور نخلنڈیو اندر داخل ہوا۔

"میرے آنے سے آپ کا ہرج تو نہیں ہوا"

میں کہنا چاہتا تھا۔ کہ مجھے واقعی کام ہے۔ لیکن یہ الفاظ میری زبان سے نہ نکل سکے۔ اور میں نے کہا "جی نہیں"

تو پھر تم والوویلا کے کمرے سے کیوں باہر چلے گئے تھے۔ تم جانتے ہو۔ کہ ہمیں آپس میں باتیں کئے عرصہ ہو گیا ہے۔ میں تم سے باتیں کرنے کا اتنا عادی ہو گیا ہوں۔ کہ اگر تم سے گفتگو نہ کروں۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہو۔

ایک ہی لمحہ میں میرا غصہ جاتا رہا۔ اور نخلنڈیو مجھے ویسا ہی نظر آنے لگا۔ جیسا پہلے تھا۔

شاید تمہیں معلوم ہو۔ کہ میں کیوں چلا گیا تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ شائد معلوم ہو۔ اور اگر میں معلوم بھی کر لوں۔ تو میں تمہیں نہیں بتانے کا۔ ہاں تم خود بتا سکتے ہو۔ ہاں۔ ہاں میں خود بتاؤں گا۔

سنو میں اس لئے چلا گیا تھا۔ کہ تم سے ناراض تھا۔ نہیں ناراض نہیں۔ بیزار تھا۔ بات صرف یہ ہے۔ کہ مجھے ہمیشہ یہ اندیشہ کھائے

جاتا ہے۔ کہ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ اس لئے کہ میں ابھی بہت چھوٹا ہوں
اُس نے میری باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ تم جانتے ہو۔ کہ میں نے
کیونکر اتنے دن باہم گذار دیئے۔ اور کیوں اوروں سے زیادہ تمہارا پاس خاطر
رکھتا ہوں۔ مجھے ابھی اس کی وجہ معلوم ہوئی ہے۔ اور وہ یہ کہ تم بڑے
صاف گو اور صاف بیان لڑکے ہو۔

ہاں۔ ہاں میں ہمیشہ وہی باتیں کہتا ہوں۔ جن کے اقبال سے مجھے
شرم آتی ہے۔ لیکن ایسی باتیں صرف انہی سے کیا کرتا ہوں۔ جن پر مجھے
پورا اعتماد ہوتا ہے۔

ٹھیک بجا۔ لیکن کسی شخص پر پورا اعتماد کرنے کے لئے اس بات
کی بھی ضرورت ہے۔ کہ اُس سے بالکل دوستوں کی طرح رہئے۔ اور
میں اور تم تو ابھی پورے دوست نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیں دوستی کے
متعلق ہم دونوں کی گفتگو یاد ہے۔ یعنی سچے دوست بننے کے لئے باہمی
اعتماد لازمی شرط ہے۔

مجھے اس بات کا تو پورا یقین ہے۔ کہ میں تم سے جو باتیں کہتا ہوں
وہ تم کسی سے نہ کہو گے۔ لیکن تم دیکھتے ہو۔ کہ ہمارے نہایت اہم اور
دلچسپ خیالات تو وہی ہیں۔ جن کے اظہار پر کوئی چیز بھی آمادہ نہیں
کر سکے گی۔

وہ خیالات کتنے خوفناک اور کتنے کمینہ ہیں۔ اگر ہمیں یہ خیال ہوتا۔ کہ ہمیں ان کا اقبال کرنا ہوگا۔ تو وہ کبھی بھی ہمارے سر میں نہ سماتے نکولس کیا تم جانتے ہو۔ میرے سر میں کیا سمایا ہے۔ وہ یہ کہہ کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مسکراتے اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہنے لگا۔ آؤ ہم وہ کام کریں اور تم دیکھو گے۔ کہ یہ بات ہم دونوں کے لیے کتنی مفید ثابت ہوتی ہے آؤ ہم وعدہ کریں کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے تمام باتوں کا اقبال کرلیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ اور شرمندہ نہ ہونگے اور نہ ہی دوسرے لوگوں سے خوف زدہ ہوں گے۔ آؤ ہم یہ عہد کریں۔ کہ ہم کبھی بھی اپنے متعلق کوئی بات کسی کو نہ بتائیں گے۔ اور یونہی کریں۔

میں نے کہا۔ آؤ یونہی سہی"۔

ہم نے واقعی ایسا کیا۔ ایسا کرنے سے کیا بیتی۔ وہ آگے چل کر بیان کروں گا۔

کار نے کہا ہے۔ کہ ہر تعلق کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ایک محبت کرتا ہے۔ دوسرا محبت کرنے دیتا ہے۔۔۔۔۔ ایک بوسہ دیتا ہے۔ اور دوسرا بوسہ کے لئے اپنے گال پیش کرتا ہے۔ یہ بات بالکل سچی ہے۔ ہماری دوستی کا بھی یہی حال تھا۔ میں بوسہ لیتا تھا۔ اور

ڈمتری اپنے گال پیش کرتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ بھی مجھے بوسہ دیتا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یکساں اُلفت تھی۔ اس لئے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مجھ پر اپنا دباؤ ڈال لیتا تھا۔ اور میں اس کے سامنے جھک جاتا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ نخلڈ بو کے زیر اثر میں بھی اسی کی طرح حلیم و منکسر مزاج ہو گیا۔ لڑکپن میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان کی بُری عادات کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ تمام بُرائیاں دور کی جا سکتی ہیں بعد تمام اچھے اوصاف پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اور انسان ہمیشہ خوش رہ سکتا ہے۔

خُدا ہی جانتا ہے۔ جوانی کے متعلق وہ پاکیزہ خواب واقعی مضحکہ خیز تھے۔ اور اس کا الزام کس پر دھرا جا سکتا ہے۔ کہ وہ معلوم نہ ہو سکے.......

جوانی

آغاز شباب

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ کہ ڈمتری کی دوستی نے میرے سامنے زندگی کا ایک نیا منظر پیش کر دیا تھا۔ اس نے اِس بات کا انکشاف کر دیا تھا۔ کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے نظریہ کا جوہر یہ تھا ۔ کہ انسانی زندگی کا مقصد اخلاق کا کمال ہے۔ نیز یہ کہ با اخلاق بننا نہایت آسان ممکن اور ابدی چیز ہے۔ مگر ابھی تک میں اِس خیال سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ اُس کا یہ نظریہ میرے استدلال کو تو خوش کر سکا۔ مگر میرے حسیات کو نہیں۔ آخر یہ خیال پوری طاقت سے مجھ میں سرایت کر گیا۔ اور مجھے یہ خواہش ہوئی۔ کہ زندگی کو انہی پر کاربند کر لوں اور کبھی ان سے انحراف نہ کروں۔

یہی زمانہ ہے۔ جسے میں اپنی جوانی کا آغاز سمجھتا ہوں۔ اس وقت میری عمر سولہ سال کی تھی۔ اور میں اپنے آپ کو امتحان یونیورسٹی کیلئے تیار کر رہا تھا۔ پڑھائی کے علاوہ میرے اوقات تنہائی میں سوچ بچار اور ورزش کرنے میں گذرتے تھے۔ کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ دنیا میں سب سے شہ زور انسان بن جاؤں۔ میں اکثر اپنا منہ شیشے میں دیکھتا۔ اور مایوس

ہو جاتا۔ میری شکل ویسی کی ویسی بھدی تھی۔ میں بالکل دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں بہت لمبے اور بے ڈھب سے تھے۔ اور میں انہیں دیکھ کر بہت شرمندہ ہوتا۔

موسم بہار اور تخیلات

موسم بہار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ بازاروں میں برف کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔ باغوں میں شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ سرسبز گھاس جا بجا اُگ رہی تھی۔ یہ بہار کا عجیب وقت تھا۔ جو رُوحِ انسانی پر گہرا اثر کرتا تھا۔ طیور جھاڑیوں میں چہچہا رہے تھے۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے مجھ پر کئی باتوں کا انکشاف کر رہے تھے مجھے ہر ایک چیز حُسن اور خوشی کا مژدہ سنا رہی تھی۔ اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ سب کچھ میرے لئے ممکن الحصول ہے۔

میں نے خیال کیا۔ کہ آج میں اپنے گناہوں کا اقرار کر لوں گا۔ اور بالکل پاک بن جاؤنگا۔ آئیندہ کے لئے کبھی بھی عبادت کو ترک نہ کرونگا ہر اتوار کو گرجے جایا کروں گا۔ بیوہ عورتوں کو خیرات بانٹوں گا۔ علیحدہ کمرے میں رہونگا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اِس کو صاف کیا کروں گا۔ کسی دوسرے آدمی کو تکلیف نہ دوں گا۔ کیونکہ سب مجھ جیسے ہی آدمی ہیں۔ کالج ہر روز پیدل جایا کروں گا۔ اپنے اسباق باقاعدہ

لکھا کروں گا۔ اور ان کے علاوہ عام کتابوں کا مطالعہ کیا کروں گا تاکہ میں
کامیابی کے ساتھ گریجویٹ بن کر باہر آؤں۔ ہر روز جس قدر ہو سکے ورزش
کیا کروں گا۔ تاکہ میں دُنیا میں سب سے زیادہ مضبوط انسان بن جاؤں۔
جب ہم کمرے میں اکٹھے ہوتے۔ تو ابّا جان اکثر وہاں پہنچ جاتے۔ اور
ہم بہت عجیب مذاق کیا کرتے۔ اِس موسم میں جُوا کھیلنے سے اُنھوں نے
بہت کچھ پس انداز کر لیا تھا۔ اور اس عادت کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے
اِس لئے اِن دِنوں وہ معمول سے زیادہ خوش نظر آیا کرتے تھے۔ جب ہم سب
اکٹھے بیٹھے تھے۔ مجھے یکایک کچھ خیال آیا۔ اور میں اپنے اتالیق سے اجازت
لے کر مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا وہاں پہنچکر کچھ اصول بنانے بیٹھ گیا۔
میں نے اپنے فرائض زندگی کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ اپنی ذات کے
فرائض۔ ہمسائیوں کے فرائض اور خدا کے فرائض..... آخر ان کی بہت
سی شقیں پیدا ہو گئیں۔ مجھے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ کاپی بنانی پڑی
چنانچہ میں نے کاغذ لیکر انہیں سی لیا۔ اور ان کے اوپر زندگی کے اصول لکھ دیا
اسی اثنا میں پادری صاحب تشریف لے آئے۔ ہمیں اپنے گناہوں کا
اقرار کرنے کے لئے ایک کمرے میں جمع ہونا پڑا۔ پہلے ابا جان گئے۔ اور سب
کے بعد میری باری آئی۔ جب میں باہر نِکلا۔ تو مجھے میری رُوح ہلکی نظر
آتی تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ جس طرح مجھ میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے

اسی طرح بیرونی دنیا میں بھی تبدیلی واقع ہو جائے۔ میں نہایت خوشی خوشی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر جونہی میں لیٹا مجھے خیال آیا۔ کہ میں ایک گناہ کا اقرار کرنا بھول گیا ہوں جس سے میری روح سخت بے چین ہو گئی۔ دوسرے دن بہت سویرے اٹھا۔ بازاروں میں کیچڑ تھی۔ اور سخت سردی پڑ رہی تھی۔ میں گرجے کی طرف اقرارِ گناہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ ایک گاڑی راستے میں جا رہی تھی۔ اُسے کرایہ پر لے لیا جب میں پادری صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو اس کمرے کی خاموشی ترتیب اور صفائی نے مجھ پر ایک نئی زندگی کا انکشاف کیا۔ یعنی تنہائی عبادت اور سچی خوشی کی زندگی۔

جب میں واپس آیا۔ تو راستے میں مجھے ہر دم یہی خیال آتا کہ پادری صاحب دل میں کہتے ہونگے۔ کہ میں آجتک ایسی پاکیزہ رُوح سے نہیں ملا اور نہ ہی ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ شاید دنیا میں ایسا اور کوئی بھی نہیں ہوگا

ہفتہ کے دن گھر کے باقی سب آدمی شہر کو روانہ ہو گئے اور دادی اماں کے اس کچے گھر میں صرف میں سینٹ جیرام اور والاویا مقیم رہے۔ میں نے اپنی وہ نوٹ بک نکالی جس پر زندگی کے اصول" لکھا تھا۔ اور اگرچہ یہ کام بالکل آسان معلوم ہوتا تھا۔ اور میرے لئے بہت خوش کن تھا اور میں اسے زندگی کا لائحہ عمل بنانا چاہتا تھا۔ مگر میں یہ بھول گیا کہ اسے بہت جلد سرانجام دینا چاہئے۔ اور اسے کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھا

مجھے اس سے راحت پہنچی۔ کہ جو بھی خیال قائم کرتا۔ وہ اس کی تینوں شقوں میں سے کسی نہ کسی پر ضرور پورا اُترآتا۔

اِمتحان کی تیاریاں

آزادی کے احساس اور اس چپیر کے وعدے کے تصور نے مجھے اِسقدر مبہوت کر دیا۔ کہ میرے قدم زمین پر نہ پڑتے۔ اس لئے میں اِمتحان کی خاطر خواہ تیاری نہ کر سکا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کل میرا امتحان ہے میں صبح ہی سے کمرے میں پڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا لیکن اچانک موسم بہار کی خوشبو کھڑکی کے راستے سے اندر آتی تو یہ معلوم ہوتا۔ کہ کسی کی یاد نہایت ہی ضروری ہے۔ میرے ہاتھوں سے کتاب خود بخود گر پڑتی اور میرے پاؤں لرزنے لگتے گویا کسی نے بٹن دبا کر مشین کو چلا دیا ہے۔

نہایت خوشگوار خواب سُرعت آہستہ اور قدرتی طور پر میرے دل میں سما جاتے۔ اور مجھے ان کی جھلک دکھائی دیتی۔ پھر ایک آدھ گھنٹے میں یہ سب نہایت خاموشی سے دماغ سے نکل جاتے۔ جب میں اپنی توجہ کو تمامتہ مبذول کرنے کی سعی کرتا۔ تو مجھے جنسِ لطیف کی آہٹ اور اس کے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی۔

میرے لئے آرام سے بیٹھنا دشوار ہو جاتا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ گھر کی خادمہ ہے۔ تاہم یہ خیال پیدا ہوتا۔ ممکن ہے وہی ہو۔ شائد وہ گذر جائے۔ اور میں اس کو نہ دیکھ سکوں۔

میں اُٹھ کر دیکھتا۔ تو وہی خادمہ ہوتی۔ اُس کے بعد کافی عرصہ تک میں اپنے آپ میں نہ آ سکتا۔ میرا دماغ خیالات میں مستغرق ہو جاتا۔ کبھی شام کے وقت جب میں شمع کے سامنے بیٹھتا۔ تو مجھے یہ معلوم ہوتا۔ کہ سب طرف خاموشی چھائی ہے۔ بالکل اندھیرا ہے، معاً میں وہاں سے اُٹھتا۔ اور اُوپر کی کھڑکی میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اور چاندنی رات کا نظارہ کرتا۔ پھر دُوسرے دن صبح دس بجے جگائے بغیر اُٹھتا

اگر میرا اتالیق سینٹ جیرام مجھے ہر وقت پڑھنے کے لئے نہ اُبھارتا اَور مجھے اِس بات کی تلقین نہ کرتا۔ کہ دُوسرے کی نظروں میں اپنی عزت بڑھاؤں۔ تو یقیناً میں امتحان میں پاس نہ ہو سکتا۔

اِمتحان

دوسرے دن یعنی ۱۶ اپریل کو میں نے نہایت عمدہ لباس پہنا اور امتحان کے لئے روانہ ہوا۔ جب میں کمرۂ امتحان میں پہنچا۔ تو عجیب غریب

شکلیں نظر آئیں۔ مگر میرے خیال میں اِن طلبا کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں۔ جو میری طرح اپنے اتالیق یا والدین کی سرپرستی میں وہاں آئے تھے۔ یہ سب نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے کبھی استادوں کو اور کبھی لڑکوں کو بنظرِ استعجاب دیکھتے تھے۔ اور جو کاغذات اپنے ساتھ لائے تھے انہیں بغیر دیکھے دھرا رہنے دیتے تھے۔

دوسری قسم میں کالج کے لڑکے تھے۔ یہ سب نہایت بے تکلفی سے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔ پروفیسر کا نام لے کر پکارتے اپنی نوٹ بکیں ایک دوسرے کو دیتے اور باہر سے چیزیں لا کر اور سر کو ڈیسک کے ساتھ چھپا چوری لگا کر کھاتے تھے۔

تیسری قسم میں بزرگ طلبا تھے۔ جو لمبے کوٹ پہنے تھے یہ بہت سنجیدہ سے تھے۔ بالکل الگ تھلگ رہتے۔ اور نہایت پژمردہ دکھائی دیتے تھے۔

دوسری قسم کے طلبا بہت ہوشیار اور آزاد تھے۔ جب پروفیسر نے حاضری کے لئے رول نمبر بولے۔ تو وہ نہایت چستی سے آگے بڑھ کر جواب دیتے۔ مگر ہم بالکل نہ جھجکتے تھے وہ مجھ سے نہایت بے تکلفی سے کہتے "لو یہ کتاب ذرا اِدھر دے دینا۔ کبھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

دوسری طرف کو دیکھتے گویا میں کوئی بیچ تھا مجھے اس وقت یہ سخت ناگوار گزرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت ارفع اور مہذب سمجھتا تھا۔

آخر تو اریخ کا امتحان ہوا۔ اور میں اوّل نمبر رہا۔

دوسرے دن حساب کا امتحان تھا۔ مجھے بعض سوال نہیں آتے تھے۔ اور خیال تھا۔ کہ کہیں ممتحن انہیں ہی نہ پوچھ بیٹھے۔ چنانچہ والو دیا ہمارے کمرے میں آیا۔ اور میں نے ایک دو سوال اس سے سمجھ لئے۔ جب میری باری آئی۔ تو جو ٹکٹ مجھے دیا گیا۔ اس کا حل مجھے نہیں آتا تھا۔ دوسرے لڑکے کو جو ٹکٹ ملا۔ اسے وہ نہیں آتا تھا چنانچہ اُس نے میرا ٹکٹ چھین لیا۔ اور مجھے اپنا دیدیا۔ سو وہ مجھے اچھی طرح آتا تھا۔ اور اُسے وہ چنانچہ میں اس امتحان میں بھی اچھی طرح پاس ہو گیا۔

تیسرے دن لاطینی کا امتحان تھا۔ لاطینی کا پروفیسر بہت بدنام تھا۔ سب ہی اس سے کانپتے تھے۔ مجھ سے پہلے جو لڑکا گیا۔ اُسے کچھ نہ آتا تھا۔ اور جو سوال اس سے پوچھا جاتا۔ اس کا کوئی جواب اس سے نہ بن آتا۔ میں وہاں کھڑا ہنستا رہا۔ پروفیسر نے اس کو بہت کافی نمبر دے۔ اس سے اس کا کچھ تعلق تھا۔ مگر مجھ سے ہنسنے کا اچھا بدلہ لیا گیا۔ مجھے اپنی لاطینی کی قابلیت پر فخر تھا۔ میری جماعت کے لڑکے وہ ترجمہ نہیں کر سکتے تھے۔ جو میں کیا کرتا تھا۔ مگر پروفیسر نے نہایت مشکل سوال

پوچھے۔ اور میرا ناک میں دم کر دیا۔ اس نے حقارت سے کہا "امتحان دینے جاتے ہیں"۔ اور مجھے بمشکل پاس ہونے کے لئے نمبر ملے۔

میں اس سے سخت بددل ہوا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسی بے انصاف یونیورسٹی میں دوسرے دن جاؤں۔ اوّل نمبر رہنے کا خیال تو ایک طرف جاتا رہا۔

جب میں آخری امتحان دے کر آیا۔ تو درزی ایک نہایت عمدہ سوٹ تیار کر کے لایا تھا۔ اور میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے وہ سوٹ پہن لیا۔ اور جس طرح والد صاحب نے امتحان پاس کرنے کے بعد کیا تھا۔ اسی طرح میں بھی فوراً بازار روانہ ہو گیا۔ اور مختلف چیزوں کی خریدار کرنے لگا۔ چنانچہ میں نے تمباکو خریدا۔ گھر پہنچ کر میں نے کش لگانے شروع کئے۔ تھوڑے ہی وقت میں تمام کمرے میں دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ میرے سر میں گرانی محسوس ہونے لگی۔ یک لخت میرے پاؤں لڑکھڑائے۔ اور میں بیہوش ہو گیا۔

دوسرے دن میری کامیابی پر جلسے ہوئے۔ اور مجھے مبارکبادیں دی گئیں۔ اور ہم سب دوستوں نے ہوٹل پر جا کر کھانا وغیرہ کھایا۔

تیسرے دن میرے ابا نے مجھ سے کہا کہ فلاں فلاں آدمی سے جا کر مل آنا۔ اگرچہ میں ان میں سے کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا مگر تعمیل حکم ضروری تھی۔ میں اکیلا روانہ ہوا۔ اور سب سے پہلے سونیا کے گھر پہنچا۔ میں نے اس کو تین سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اور میرا عشق دیر کا ختم ہو چکا تھا۔ مگر

میری رُوح میں سونیا کی محبّت کی ایک دلگداز یاد ابھی باقی تھی۔ اس تین سال کے عرصہ میں بعض اوقات ایسی صاف اور سخت یاد آئی۔ کہ میرے آنسو نکل آئے۔ اور میں اپنے آپ کو دوبارہ اُس کی محبّت میں اسیر پاتا۔ مگر یہ حالت تھوڑی دیر تک قائم رہتی۔ جب میں ان سے ملا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ اب اُن کی وہ پہلی سی حالت نہ رہی تھی۔ اور بہت زیادہ تغیّر رُونما ہو گیا تھا۔

میں حسبُ الحکم سب سے مل آیا۔ اور اُن سے مِل کر عجیب حالتوں کا تجربہ ہوًا۔ جب میں وہاں سے لوٹ آیا۔ تو اپنے ایک دوست سے ملنے کو روانہ ہوا۔

ہم دونوں بے ارادہ ایک طرف چلنے لگے۔ اور ہمیں یہ معلوم بھی نہ ہوا۔ کہ آسمان پر بادل چھا رہے ہیں۔ دائیں طرف درختوں کے پار مکانوں کے طرح طرح کے چھتیں نظر آتے تھے۔ کسی پر دُھوپ تھی۔ اور کسی پر سایہ۔ بائیں طرف ذرا نیچے ایک نیلے رنگ کا خاموش تالاب تھا۔ جس پر دیوار کے درخت جُھکے ہوئے تھے۔ اور اس پر اندھیرا چھایا ہوا تھا سڑک کے دونوں طرف رائی کے سبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ جنھوں نے میرے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا۔ ہوا بالکل خاموش اور مُعطّر تھی۔ رائی کے پودوں میں کوئی جنبش نہ تھی۔

انہی پودوں میں ایک پگ ڈنڈی چکر کھاتی ہوئی جاتی تھی۔ اور یہ پگ ڈنڈی سونیا کی محبت کی یاد میرے دل میں تازہ کر دیتی تھی۔ اب میں اپنے دوست کی داستانِ محبت جمدہ بیان کر رہا تھا۔ سننا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اپنے اور سونیا کے عشق کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا جو مجھے اس کے عشق سے بلند تر نظر آتا تھا جب میرا دوست دمتری کے خیالات میں مستغرق تھا میں نے اس کی توجہ ان مناظر کی طرف منعطف کرانی چاہی۔ مگر مناظر کا اثر اس پر مجھ سے بہت مختلف ہوتا تھا۔ وہ شاید ان سے دلائل سے محبت کرتا تھا۔ نہ کہ جذبات سے۔

محبت

چونکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ صوفیا آدالونا ان نادر الوجود متوسط عمر عورتوں میں سے ہے۔ جن کی تخلیق کا مدعا تو خانگی زندگی ہوتا ہے لیکن قدرت ان کو اس خوشی سے محروم رکھتی ہے۔ اور وہ اس محرومی کی وجہ سے دفعتاً یہ فیصلہ کر لیتی ہیں۔ کہ ان کے دل میں بچوں اور خاوند کے لئے محبت کا جو خزانہ بھرا ہوا ہے وہ چند چیدہ اشخاص پر صرف کر دیں۔ اس قسم کی بوڑھی خادماؤں میں یہ خزانہ محبت اتنا غیر محدود اور ناقابلِ اختتام ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ وہ یہ خزانہ بہت سے منتخب اشخاص پر

صرف کرتی ہیں۔ پھر بھی بچ رہتا ہے۔ کہ وہ ان تمام بھلے یا بُرے اشخاص سے بھی محبت کرتی ہیں جن سے ان سے زندگی میں ملنے کا اتفاق ہوتا ہے

محبت کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ خوبصورت اُلفت۔

۲۔ خودفراموش اُلفت۔

۳۔ عملی اُلفت۔

مَیں ایک نوجوان عورت سے ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان مرد سے ایک نوجوان عورت کی محبت کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے تو ایسے چونچلوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں زندگی بھر اتنا بدنصیب رہا۔ کہ مجھے کبھی ایسی اُلفت میں سچائی کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ ہاں ایسی محبت میں جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ ایسی محبت نے روپیہ۔ لالچ اور تعلق کے بندھنوں میں نوجوان عورتوں اور مردوں کو ایسا جکڑا ہوا ہے۔ کہ ان کی محبت سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ محبت سے میری مراد مرد کی محبت ہے۔ جو اپنی کم یا زیادہ رُوحانی طاقت کے مطابق ایک ہی شخص یا چند اشخاص پر مرکوز ہوتی ہے۔ یا جس کے بہت سے حصّہ دار ہوتے ہیں مثلاً ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بچّہ۔ رفیق۔ دوست۔ ہم وطن۔ یہ محبت مرد کی محبت ہے۔

خوبصورت الفت خیال کی ذاتی خوبصورتی اور اس کے مظاہر کی محبت ان لوگوں کے نزدیک جو اس طرح محبت کرتے ہیں۔ محبت والی چیز صرف اس حد تک پیاری اور محبوب ہے۔ کہ وہ خوشگوار خیالات پیدا کرتی ہے۔ جن کا احساس یا اظہار ان کو مسرور و خنداں بنا دیتا ہے۔ جو لوگ خوبصورت محبت کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی قطعاً پروا نہیں کرتے کہ جس شے سے ہم محبت کرتے ہیں کیا وہ بھی ہم سے محبت کرتی ہے۔ اگر ان کی محبت کے جواب میں ان کا محبوب ان سے محبت کرے۔ تو یہ محض ایک اتفاقی امر ہے۔ ورنہ ان کے محبوب کی محبت ان کے خیالات کی خوبصورتی اور مسرت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ ایسے لوگ اکثر اپنے محبوب بدلتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا اہم ترین مقصد صرف یہ ہے۔ کہ جذباتِ الفت کو ہمیشہ مشتعل کیا جاتا رہے۔ وہ اپنے وجود میں محبت کا یہ خوشگوار ہیجان برقرار رکھنے کے لئے اس کے اظہار کے دفتر اپنے محبوب اور ان لوگوں کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں ایک خاص طبقہ کے آدمی جو خوبصورت محبت کرتے ہیں۔ نہ صرف ہر ایک کے سامنے اپنی محبت کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ بلکہ فرانسیسی کو اس محبت کے اظہار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یہ بات مضحکہ انگیز اور عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ

ہماری سوسائٹی اور بالخصوص عورتوں کے ایک خاص طبقے میں بہت سے افراد موجود ہیں۔ جو اپنے دوستوں۔ خاوندوں اور بچوں سے اسی نوع کی محبت کرتی ہیں۔ ان کی محبت کا یہ حال ہے۔ کہ اگر انہیں فرانسیسی میں اپنی محبت کے اظہار سے روک دیا جائے۔ تو ان کی محبت فی الفور غائب ہو جائے۔

دوسری قسم کی محبت یعنی خود فراموشانہ الفت کے یہ معنی ہیں۔ کہ کوئی شخص خود کو اپنے محبوب پر قربان کر دے۔ اور اس بات کا خیال نہ کرے۔ اس قربانی سے محبوب کو کچھ نقصان پہنچے گا۔ یا فائدہ ہوگا۔ اس قسم کی محبت کا فارمولا یہ ہے۔ کہ میں اپنے محبوب کو اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے ہر قسم کی مشکل اور مصیبت جھیلنے کو تیار رہوں۔ جو لوگ اس طرح محبت کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کرتے۔ کہ کیا ہمارا محبوب ہم سے الفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس شخص کیلئے جو اپنی فطرت سے واقف ہے۔ قربان ہو جانا زیادہ قابلِ تحسین ہے۔ اس قسم کے عاشق ہمیشہ مجنونِ الفت نظر آتے ہیں۔ وہ بالعموم ثابت قدم ہوتے ہیں۔ وہ ان قربانیوں کی قدر کھو دینا نہیں چاہتے۔ جو انہوں نے اپنے محبوب کے لئے کی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے محبوب یا محبوبہ کے لئے مر مٹنے پر ہمیشہ آمادہ نظر آتے ہیں۔ تاکہ وہ دکھا دیں۔ کہ انہیں ان سے

الفت ہے۔ لیکن وہ محبت کے ایسے ثبوت جو معمول جاتے ہیں جو روز مرہ پیش آتے ہیں۔ اور جن میں قربانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ کہ آیا آپ کو اچھی خوراک ملتی ہے۔ یا آپ اچھی طرح سوتے ہیں یا آپ مسرور خنداں ہیں۔ وہ آپ کے لئے سامان تعیش بہم پہنچانے۔ خواہ ایسا کرنا ان کے اختیار میں کیوں نہ ہو۔ ہاں وہ محبت کی وجہ سے گولیاں کھانے۔ آگ یا پانی میں کودنے اور خود کو فنا کر دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اور یہی ان کی محبت کا ثبوت ہے۔ وہ یہ ثبوت بہم پہنچانے کے لئے موقع کے منتظر رہتے ہیں اس کے علاوہ جو لوگ خود فراموشانہ الفت پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ محبت میں شوخ و مغرور حاسد شکی اور اپنے محبوب کو اپنی محبت جتانے کے لئے ہر قسم کی مصیبت مول لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کو مصیبت سے بچانے یا اسے آرام پہنچانے کے لئے آمادہ رہتے۔ اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے نازیبا طریقے اختیار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

فرض کیجئے کہ آپ اپنی بیوی کے ہمراہ دیہات میں رہتے ہیں اور آپ کی بیوی کو آپ سے خود فراموشانہ الفت ہے۔ آپ تندرست وتوانا ہیں۔ آپ اکثر مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ آپ کی محبت شعار

بیوی اتنی نازک اندام ہے کہ وہ امورِ خانہ داری سرانجام نہیں دے سکتی
اور یہ کام نوکروں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ بچوں کی پرورش بھی نہیں کر سکتی
اور انہیں ماماؤں کی نگرانی میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ نہ ہی وہ کسی اور شغل کو
پسند کرتی ہے۔ کیونکہ اُسے سب سے بڑھ کر آپ سے محبت ہے
وہ بیمار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ آپ کو غمزدہ کرنا نہیں چاہتی۔ اسلئے
اپنی بیماری کو آپ سے چھپاتی ہے۔ اسے کوئی دُکھ ہے۔ لیکن وہ
ساری زندگی اسی طرح بسر کر دے گی۔ اور آپ کو نہیں بتائیگی
آپ کسی کام میں مثلاً کاروبار کتب بینی۔ ورزش۔ کھیتی باڑی میں
بہت منہمک رہتے ہیں۔ مگر یہ انہماک اُسے بہت ناگوار ہے۔ اگر آپ
اسے ترک کر دیں۔ تو اس کی تمام کلفتیں دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ
خاموش ہے۔ اور تمام تکالیف خاموشی سے برداشت کرتی ہے۔ پھر
آپ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ آپ کی بیوی اپنی خرابیٔ صحت بھول جاتی
ہے۔ اور اگرچہ آپ کہتے ہیں۔ کہ وہ بے فائدہ تشویش نہ کرے۔ لیکن
وہ تمہارے پلنگ کے قریب بیٹھی رہتی ہے۔ اور آپ اس کی ترحم
آمیز نگاہیں اپنے چہرے پر گڑی ہوئی دیکھتے ہیں۔ گویا وہ کہہ رہی ہے
میں نے تم سے لاکھ کہا۔ کہ ایسا نہ کرو۔ لیکن تم نہ مانے اور بیمار ہو گئے
اچھا تم میری نہ سنو۔ لیکن میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ صبح ذرا آپ اچھے

ہوں۔ تو دوسرے کمرے میں چلے جائیں۔ کمرہ میں آگ نہیں جلائی گئی
اور نہ اس کا سامان درست کیا گیا ہے۔ نہ آپ نے شوربا مانگا ہے
اور نہ دوا طلب کی ہے۔ لیکن آپ کی محبّت شعار بیوی آپ کو بڑی
متفکّر و ملول نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے
سخت نڈھال ہے۔ لیکن وہ اپنی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتی۔ اور
دبے پاؤں چل کر نوکروں کو نہایت آہستہ آواز میں احکام دیتی ہے۔
آپ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ بڑی لجاجت سے کہتی ہے۔ کہ
ایسا نہ کیجئے۔ اس سے صحت خراب ہو جائے گی۔ آپ کمرہ میں چہل قدمی
کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ آپ کو اس سے روکتی ہے۔ کہ اس سے تکلیف
بڑھے گی۔ آپ کسی دوست سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی
بیوی آپ کو اس سے منع کرتی ہے۔ رات کو آپ پھر بیمار پڑ جاتے
ہیں۔ آپ کی بیوی آپ کے بستر کے قریب آرام کرسی پر بیٹھی رات گذار
دیتی ہے۔ وہ سرد آہیں بھرتی ہے۔ اس کی ذرا سی حرکت سے
آپ بے حس ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں ایک نوکر ہے۔ جو بیس
سال آپ کی خدمت کر رہا ہے۔ اور اپنی خدمات کا معاوضہ لیتا ہے
آپ کو اس پر پورا اعتماد ہے۔ لیکن آپ کی بیوی اس کو دو منٹ بھی
نہیں ٹھہرنے دے گی۔ وہ تمام کام اپنی کمزور اور غیر عادی اور نا

ترتیب یافتہ انگلیوں سے کرتی ہے۔ وہ اپنی سفید انگلیوں سے ایک دوائی کی بوتل کھولتے۔ پیالی میں انڈیل کر پلاتے حتیٰ کہ شمع بجھانے تک غرض تمام کام خود کرتی ہے کبھی آپ کو دوستانہ و متفکرانہ انداز سے چھوتی ہے۔ اگر آپ میں ضبط کا یارا نہیں۔ تو آپ اپنی بیوی سے کہتے ہیں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ غریب کمرے سے نکل کر سرد آہیں بھرتی ہے۔ اور نوکر سے یونہی کانا پھوسی کرتی ہے۔ آخر جب آپ موت کے منہ سے بچ رہتے ہیں۔ تو آپ کی بیوی بیس روز کی بے خوابی کے باعث بیمار پڑ جاتی ہے۔ اور وہ پہلے سے زیادہ کام کے ناقابل بن جاتی ہے۔ اور جب آپ بالکل تندرست ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اپنی جان نثارانہ محبت کا ذکر نہ صرف آپ سے بلکہ ایک سے کرتی ہے۔ جو اس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

تیسری قسم کی محبت کا نام عملی محبت ہے۔ ایسی محبت میں عاشق اپنے محبوب یا محبوبہ کی تمام ضروریات اور نیک و بد خواہشات پورا کرتا ہے۔ اس قسم کی محبت دیرپا ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ عرصہ وہ محبت کرتے ہیں۔ اتنا زیادہ ان کو اپنے محبوب کی طبیعت و حالات معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے اپنے محبوب سے محبت کرنا یعنی اس کی جملہ خواہشات پوری کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان کی محبت شاذ ہی الفاظ کا

جامہ پہنتی ہے۔ اور اگر کبھی اِسے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ تو خوبصورت طریقہ سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بھدّے انداز سے آوڑ ڈرتے ڈرتے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انہیں ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ کافی طور پر محبت نہیں کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے محبُوب کی غلطیوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسی غلطیوں سے عاشق کو اپنے محبُوب کی ہر بدخواہشات پُورا کرنے کا موقعہ مِل جاتا ہے۔ وہ اپنی محبت کا جواب محبت میں مانگتے ہیں۔ اور بہت جلد دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور جب اِن کا محبُوب اِن کی محبت کا حوصلہ افزا جواب دیتا ہے۔ تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر جواب حوصلہ افزا نہ ہو تو وہ جی نہیں ہارتے۔ محبت کئے جاتے ہیں۔ اور نہ صرف اپنے محبُوب کی خوشی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ بلکہ حتیٰ الامکان ہمیشہ اس کی خوشی و مسرت کو ہر قسم کے اخلاق و مادی ذرائع سے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈمیتری بھی مجھ سے اپنی ہمشیرہ۔ بھتیجے بھتیجی اور ریبوبرسر گیوناسے اس قسم کی محبت کرتا تھا۔ اور اِس محبت کی چمک صوفیا آیوانوونا کی آنکھوں اور اُس کے ہر ہر لفظ سے ظاہر تھی۔

بہت عرصہ گذر جانے کے بعد میں نے صوفیا آیوانوونا کی قدر پہچانی۔ لیکن اِس وقت بھی میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا۔ کہ جب

ڈمتری دوسرے نوجوانوں سے بالکل جدا طریقہ پر محبت کرتا ہے
اور اس کی آنکھوں میں اس کی پیاری اور محبوب صوفیا الوا لودنا کی تصویر
بسی رہتی ہے۔ تو وہ کیسے ناقابل فہم لیوبو دسر گیونا کی محبت میں بے طرح
اسیر ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کی خالہ میں بھی اس جیسی نیک
صفات موجود ہیں۔ بلا شبہ یہ مثل بالکل سچ ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے ملک
میں پیغمبر نہیں بن سکتا۔ اس مثل کے سچ ہونے کی ان میں سے کوئی
ایک وجہ ہے۔ یا تو ہر شخص میں نیکی سے زیادہ بدی ہوتی ہے۔ یا آدمی
کی خصلت ہی ایسی ہے۔ کہ اس میں نیکی سے زیادہ بدی ہے ڈمتری
اور لیوبا سر گیونا میں قلیل مدت سے شناسائی تھی۔ لیکن ڈمتری اپنے
پیدائش کے وقت ہی سے اپنی چچی کی محبت کا لطف اٹھا رہا تھا۔

میری مصروفیتیں

میں ان ایام میں عورتوں سے زیادہ گھل مل گیا۔ کیونکہ مجھے گانے
بجانے کا بہت اشتیاق تھا۔ موسم بہار میں ہمارا ایک پڑوسی ہمیں ملانے
کے لئے آیا۔ وہ نوجوان تھا۔ اور جس وقت سے کمرے میں داخل ہوا تھا
اسی وقت سے پیانو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے آہستہ آہستہ

اپنے موضوع کو بدلا۔ اور راگ کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ کہ میں بھی پیانو بجا سکتا ہوں۔ اُس نے اپنی کرسی کو پیانو کے پاس سرکا لیا۔ اور دو تین راگ گائے۔ کاٹیا اُس کے پاس کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ کبھی ہمارے ہاں نہ آیا۔ لیکن مجھے اُس کا گانا بہت پسند آیا۔ اس کا اس تمکنت سے پیانو کے سامنے بیٹھنا۔ اپنے بالوں کے پیچھے کی طرف جھٹکنا اور خاص کر اس کے ہاتھوں کی جُنبش مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ان پُر وقار حرکتوں نے میرے دل میں پیانو سیکھنے کی خواہش پیدا کر دی۔ اس خیال کے زیر اثر اور یہ کہ مجھ میں اسکے سیکھنے کی اہلیت موجود تھی۔ میں نے اسے سیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے بغیر کسی اُستاد کی مدد کے مشق شروع کر دی۔ اور بعینہ وہ حرکتیں کیں۔ جو عورتیں کیا کرتی ہیں۔ بہر حال کاٹیا کی امداد سے میں وقت بے وقت بےسُرا راگ الاپنے لگا۔

کٹیا کا ایک بہت محبوب راگ تھا جس پر اُس کی اُنگلیاں اس قدر جلدی چلتی تھیں۔ کہ کسی دوسرے سے ایسا ہونا ناممکن تھا۔ میں بھی اسکی نقل کرتا۔ اور وہ سب حرکتیں کرتا۔ جو ایک جوان آدمی کو کرنا چاہیئے۔ اور مجھے یہ خیال کر کے بہت افسوس ہوتا۔ کہ کوئی باہر کا آدمی مجھے دیکھنے والا نہیں ہے۔ اس وقت میرے پیانو بجانے کا مقصد صرف نوجوان لڑکیوں پر

ڈورے ڈالتا تھا۔ لیکن جس وقت میں گانے بجانے میں ذرا ماہر ہوا۔ مجھے اپنی اس قابلیت کا علم ہوا۔ اُس وقت مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ اگر میں اس کو فن کی حیثیت سے سیکھتا۔ تو واقعی بڑا اچھا گویّا بن سکتا۔

فرانسیسی ناولوں کو پڑھنا میرا دوسرا شغل تھا۔ والو دیا نے بہت سے ناول جمع کر رکھے تھے۔ اُس وقت موزیوں کا جرز یرہ وغیرہ ناول ابھی تازہ تازہ شائع ہوئے تھے۔ مجھے یہ سب ناول باوجود غیر قُدرتی ہونے کے مجھے بالکل قدرتی معلوم ہوتے تھے۔ ناول کے افراد اور قصّے مجھے سچّے معلوم ہوتے۔ اگرچہ میں اِس قسم کے لوگوں سے کبھی نہیں ملا تھا۔ لیکن مجھے خیال تھا۔ کہ میں ایک دِن اِن سے ضرور مِل سکوں گا۔

ناول پڑھتے وقت اگر کسی بد معاش کا ذکر آ جاتا۔ تو مجھے یہ معلوم ہوتا۔ کہ یہ سب خصوصیتیں مجھ میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ اگر کسی بہادر اور نیک آدمی کا ذکر آجاتا۔ تو بھی مجھے یہی معلوم ہوتا کہ ان سب خصوصیات کا حامل میں بھی ہوں۔ بالکل اِس طرح جس طرح کہ ایک حساس آدمی طب کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے سمجھنے لگ جاتا ہے۔ کہ اِس بیماری کی علامتیں مجھ میں پائی جاتی

ہیں۔ اور اُس کی بھی۔ میں ناول کے تمام اِفراد کو اچھا سمجھتا تھا۔ خواہ وہ بہت ہی بُرے ہوئے ہوں یا بہت ہی اچھے اخلاق کے مالک ہوں۔ میرے لئے یہ سب یکساں دلچسپی کا باعث ہے۔

ایک دفعہ میں نے ایک ناول کو پڑھا۔ جس میں ایک نیک آدمی کا ذکر تھا۔ اُس کے حُلیے کے متعلق لکھا تھا۔ کہ اِس کی بھوں پر بڑے گھنے بال تھے۔ مجھے یہ خیال ہوگیا۔ کہ میری بھویں بھی ویسی ہی ہونی چاہئیں۔ میں شیشے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اور بھویں کاٹنے لگا۔ تاکہ وہ گھنی ہو جائیں۔ لیکن وہ کاٹتے اور یکساں بناتے بناتے بالکل صفاچٹ ہوگئیں۔ اور میری صورت بڑی بھونڈی نظر آنے لگی۔

جوانی

میں اکثر کھلی ہوا میں برآمدے کے اوپر سوتا۔ صبح سورج کی ترچھی کرنیں مجھے جگایا کرتیں۔ میں جلدی سے کپڑے پہنتا۔ تولیا بغل میں دباتا۔ اور گھر سے کوئی چوتھائی میل کے فاصلے پر سدرخنور کے

سامنے میں سے گذرتا ہوا دریا پر نہانے جاتا۔ وہاں میں گھاس پر لیٹ جاتا کبھی کتاب کا مطالعہ کرتا۔ اور کبھی اس منظر سے لطف اٹھاتا۔ اور چھوٹی چھوٹی لہروں سے دل بہلاتا جب وہاں کافی عرصہ بیٹھ چکتا۔ تو اٹھ کر واپس ہوتا۔ اور سڑکوں کو چھوڑ کر جنگل میں ہو لیتا۔ چنانچہ میں کچھ کھویا ہوا سا آگے بڑھا جاتا۔ اس وقت کبھی میں اپنے آپ کو جرنیل سمجھتا۔ کبھی وزیر خیال کرتا کبھی غیر معمولی طور پر مضبوط اور کبھی پر از جذبات انسان۔ جب راستے میں مجھے کسان کام کرتے نظر آتے۔ تو میں سست پڑ جاتا۔ اور ان سے کنارہ کش ہونے کو جی چاہتا۔

جب شمعیں ڈرائینگ روم سے اوپر کے کمروں میں لے جاتے اور وہاں سے عورتوں کی آوازیں آنا شروع ہوتیں۔ تو تبھی میں کھڑکی بند ہونے اور کھلنے کی آوازوں کو غور سے سننا لگے پاؤں کی ذرا سی آہٹ۔ کھانسی یا دم لینے کی آواز۔ کماڑوں کی جنبش یا کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی میں اپنی چٹائی سے اٹھ بیٹھتا۔ چوروں کی طرح آہٹ پر کان لگاتا۔ ادھر ادھر جھانکتا۔ اور بغیر کسی ظاہر اور دلیل کے طبیعت میں امنگ پیدا ہو جاتی۔ روشنی جب اوپر کے کمرے میں چلی جاتی۔ اور سامنے والے باغ میں بالکل اندھیرا ہو جاتا۔ بازاروں میں پہرہ دار گشت لگاتے۔ تو میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں فوکا کی

باتیں سُنتا۔ جو یہ سمجھتا تھا۔ کہ اس وقت کوئی اس کی گفتگو نہیں سُن رہا۔
آخر روشنی بالکل گُل کر دیجاتی۔ اور کھڑکیاں بند کر دیجاتیں۔ میں مکان کے سامنے سلئے میں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ اور جھکتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا کہ کوئی حسین عورت یہاں باغ کی روش پر یا میری چٹائی کے گرد تو نہیں کھڑی ہے۔ پھر میں نہایت تیزی سے برآمدے کی طرف بھاگ جاتا۔ اور بستر پر لیٹ کر اپنے جسم کو مچھروں اور چمگادڑوں سے بچانے کیلئے ڈھانپ لیتا۔ اور عشق و محبت کے دِل خوش کُن خواب دیکھتا۔
اس وقت ہر ایک چیز میرے لئے نئے نئے معنی لئے ہوئی سامنے درختوں کے پتوں پر چاندنی کا انعکاس اور سڑک پر درختوں کا سایہ۔ نیچے تالاب کا خاموش اور چمکتا ہوا پانی۔ اور برآمدے کے سامنے چاندنی پھولوں پر شبنم کی جھلک۔ کوئل کی کوکو۔ باغ میں سیب کے گرنے کی آواز۔ مینڈکوں کی چھلانگوں کی سراہٹ۔ چاندنی میں ان کی سبزی مائل چمکتی ہوئی پُشت سب میرے لئے انتہائے حُسن اور مکمل خوشی کا پیغام ہوتیں۔ اور مجھے خیال ہوتا۔ کہ کوئی مجھ سے محبت کرنے کے لئے یہاں آپہنچا ہے۔ اور اس کی محبت پر ایک لمحہ پھر میں اپنی تمام زندگی قربان کرنے کے لئے تیار ہوتا۔ چاند بلند ہو کر زیادہ روشن ہو جاتا۔ تالاب زیادہ شگاف دکھائی دیتا۔ اور مجھے معلوم ہونے لگتا۔ کہ

میں اپنی اُس محبوبہ کے او نزدیک پہنچتا جا رہا ہوں - جو خوبصورتی اور خوشی کا منبع ہے - اور خوشی کے آنسو میری آنکھوں میں بھر جاتے ہیں اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ قدرت - چاند اور میں سب کے سب بالکل یکساں اور ایک ہی ہیں -

ابّا جان کی دُوسری شادی

میرے ابّا کی عمر ۴۸ برس کی تھی - اور اب انہیں ہماری ہی ایک ہمسایہ عورت سے محبت ہو گئی تھی - اِس سے پیشتر ہمارے اور اُن کے تعلقات بہت کشیدہ رہتے تھے - اور ہماری وجہ سے انہیں سخت نقصان پہنچا تھا - میں چونکہ اسی ماحول میں پلا تھا - اِس لئے شروع ہی سے اِس خاندان کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتا تھا - آخر ایک دن ہمارے ابّا نے اعلان کر دیا - کہ وہ اوویتا واسلوینا سے شادی کرنے والے ہیں - جب یہ سرکاری اعلان جاری ہو گیا - تو سب اِس پر مختلف زاویہ نگاہ سے بحث کرتے رہے - تمام دن ممی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی - اور روتی رہی - لو بیا البتہ بہت خوش خوش تھی - اور جب ہم کھانا کھا رہے تھے - تو اُس نے کہا - کہ مجھے ایک بات معلوم ہے

نہ بتاؤں گی کسی کو نہیں۔ دالودیا نے جواب دیا۔ کہ تمہارے اس راز میں کوئی خاص بات نہیں۔ اور اگر ہم کسی چیز کو سنجیدگی سے سوچنے کی عادت رکھتی۔ تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ بہت بُری بات ہے۔ لوبیا نے غور سے اس کو دیکھا۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ پھر دالودیا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ جانتے ہو۔ لوبیا کیا راز افشا کرنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہم تنہائی میں شاذ ہی آپس میں ہمکلام ہوئے تھے۔ اور اب ہم میں ایک جھجک سی پائی جاتی تھی۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے بھتنے ناچنے لگے تھے۔ مگر اس سراسیمگی کے جواب میں وہ میری آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا مجھ سے کہہ رہا ہے۔ کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں بھائی بھائی ہی تو ہیں۔ اور خاندانی معاملات میں ہمیں ایک دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیئے۔

میں اس کو سمجھ گیا۔ اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ تمہیں معلوم ہے۔ بابا ایپی فونا سے شادی کرانے والے ہیں۔ میں نے جواب میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ میں یہ پہلے ہی سُن چکا تھا۔

دالودیا نے کہا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

کیوں؟

اس نے حیران ہو کر کہا۔ کیوں! یہ بات ہمارے حق میں نوبت

بڑی ثابت ہوگی۔

مَیں نے دریافت کیا کہ ابا شادی کیوں کرنے لگے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔ بھائی یہ اِن کی عادت ہے۔ کہ وہ ہر ایک عورت پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ اور اب تو انہیں اِس عورت سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

اِس وقت لوبیا اندر داخل ہوئی۔ اُس نے خوشی سے کہا۔ اچھا تمہیں معلوم ہے۔

والودیا نے جواب دیا۔ ہاں مگر لوبیا میں حیران ہوں۔ کہ تم کوئی بچے تو ہو نہیں۔ کہ یہ خبر سُن کر خوش ہوتی۔

لوبیا نے کہا "اِس میں کیا ہرج ہے۔ نہیں تمہیں ابا پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے۔

والودیا نے نفرت سے کہا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ کہ ایسی لونا تمہاری والدہ مرحومہ کی جگہ لے رہی ہے۔

لوبیا چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا میں سمجھتی تھی۔ کہ تم مغرور رہو۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ تم اِس قدر کینہ پرور بھی ہو۔

دوسرے دن صبح موسم خراب تھا۔ جس وقت میں کھانا کھانے

کے لئے کمرے میں پہنچا۔اس وقت نہ تو ابھی ابا ہی پہنچے تھے۔ اور نہ دوسری مستورات باہر کا فرش خشک ہو رہا تھا۔زرد پتے اڑا اڑا کر رستے پر پڑ رہے تھے۔اور میں ابا کی شادی کے خیالات میں مستغرق تھا۔ اُن کے اس فعل کو بنظر حقارت دیکھتا تھا۔کہ کوئی عورت بغیر کسی استحقاق کے میری مرحومہ والدہ کی جگہ پر ڈاکہ ڈالے۔

میں اپنے والد کو زیادہ قابل الزام سمجھنے لگا۔اور ان سے ملنے سے بیزار ہو گیا۔اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

لوبیا نے آ کر کہا " ابا بلاتے ہیں۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا۔تو ابا پیانو بجا رہے تھے۔مگر ان کے چہرے سے افسردگی کے نشانات ہویدا تھے۔اب جوانی اور خوشی کے وہ آثار مفقود ہو گئے تھے۔

انھوں نے ہماری طرف مخاطب ہو کر کہا۔میرا خیال ہے تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا۔کہ میں اودنیا د اسلونیا کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔یہاں وہ کچھ ٹھہر گئے۔

میرا ارادہ نہیں تھا کہ تمہاری والدہ کے بعد شادی کرتا۔ دہ کچھ دیر کے لئے جھجکے) یہ قسمت کی بات ہے۔کہ وہ ایک اچھی عورت ہے۔ اور کوئی ایسی جوان بھی نہیں۔مجھے اُمید ہے کہ تم اس سے محبت کرو گے

وہ پہلے ہی سے تمہیں دل سے محبت کرتی ہے۔ جب میں نے دیکھا۔ کہ ہمارے والدین ہم سے شرمندہ ہیں۔ اور اپنے آپ کو ہمارا مجرم خیال کرتے ہیں۔ تو میں اُن سے نزدیک ہو گیا۔ مگر والودیا اسی طرح سگرٹ کے کش لگاتا ہوا ٹہلتا رہا۔ اُنہوں نے بازو والودیا کی طرف پھیلائے۔

اُس وقت میں نے دیکھا۔ کہ ان کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ مجھے خیال پیدا ہوا۔ کہ لڑائی میں جب ابا گئے تھے۔ تو انہوں نے کس قدر بہادری دکھائی تھی۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

اُنہوں نے لوبیا کے سر کو پکڑ کر اس کی آنکھوں پر بوسہ دیا۔ تو اُس وقت اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

والودیا اپنی پائپ رکھنے کے بہانے سے جھکا۔ اور اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔

شادی کوئی پندرہ دن میں ہونے والی تھی۔ مگر ہمارے یونیورسٹی لیکچر شروع ہونے کو تھے۔ اس لئے میں ستمبر کے آغاز ہی میں ماسکو روانہ ہو گیا۔

جب میں کالج کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو مجھے اپنی ہستی بالکل ہیچ سی نظر آئی۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے لڑکے بشاش بشاش داخل ہو رہے میری مجھ سے کسی سے ملاقات نہ تھی۔ میرے ہر طرف قہقہے بلند ہو رہے

تھے۔ اور نہایت تپاک سے مصافحہ کئے جا رہے تھے۔ کچھ دن کے بعد میں بھی اِن پر مِل جُل تو گیا۔ مگر حقیقی دوستی کی رُوح مفقود تھی۔

عشق و محبّت

میں اس موسم سرما میں عشق و محبّت کے جھگڑوں میں بہت مصروف رہا۔ ایک دفعہ میں ایک نہایت خوبصورت خاتون کے دامِ حُسن میں پھنس گیا۔ یہ خاتون مدرسہ شاہسواری میں تعلیم حاصل کرتی تھی اور منگل اور جمعہ کو گھوڑے پر سوار ہو کر سکول جاتی تھی۔ میں اِن دنوں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیئے سکول چلا جاتا۔ لیکن ہمیشہ مجھے اِس بات کا خوف رہتا۔ کہ مُبادا وہ مجھے دیکھ لے۔ اِسی خوف کی وجہ سے میں ہمیشہ اِس سے دُور کھڑا ہوتا۔ اور جس راستے سے اُسے گزرنا ہوتا وہاں سے فی الفور ہٹ جاتا۔ اگر وہ اتفاقیہ میرے قریب سے گزرتی اور مجھ پر نظر ڈالتی۔ تو میں بہت بے پروائی سے مُنہ موڑ لیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ مجھے اچھی طرح سے اُس کا رُخِ زیبا دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اور مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کہ وہ واقعی خوبصورت تھی یا نہیں۔

ڈبکو اِس خاتون کو جانتا تھا۔ ایک روز میں مدرسہ شاہسواری میں

دربان کی اوٹ میں چھپا کھڑا تھا۔ کہ ڈیکو بھی وہاں آپہنچا۔ اُسے ڈمتری کی زبانی اُس خاتون سے میرے عشق کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس لئے اُس نے مجھ سے کہا۔ چلو میں اِس خاتون سے تمہارا تعارف کرا دوں میں اِس کی بات سُن کر کانپ اُٹھا۔ اور اتنا ڈرا کہ وہاں سے سر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور آئندہ اس بات سے مجھے مدرسہ جاتے خوف معلوم ہوتا۔ کہ ڈیکو نے اس خاتون سے میرا ذکر نہ کر دیا ہو۔ میں نے پھر کبھی مدرسہ کے اندر داخل ہونا تو کجا۔ دربان کے قریب پہنچنے کی بھی جرأت نہ کی۔ کہ کہیں اس خاتون سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

جب مجھے اجنبی عورتوں اور بالخصوص شادی شدہ عورتوں سے عشق ہوتا۔ تو مجھ پر شرم اتنی غالب آتی۔ کہ سونیا کے عشق میں نہ ہوئی تھی اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا۔ کہ میری محبوبہ کو میرے عشق یا میری موجودگی کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ تو میں بہت گھبرا جاتا۔ اور ڈرتا میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ اگر میری محبوبہ کو میرے جذبۂ عشق کا علم ہو گیا۔ تو وہ اسے ایک ناقابل معافی توہین خیال کرے گی۔ اگر واقعی شاہسوار خاتون کو معلوم ہو جاتا کہ میں دربان کی اوٹ میں کھڑا یہ خیالی پلاؤ پکا رہا ہوں۔ کہ میں اِس کو اپنے گاؤں میں لے جاؤں گا۔ اور وہاں اس سے اِس طرح زندگی بسر کروں گا۔ اِس طرح سلوک کروں گا۔ تو اُسے ضرور صدمہ ہوتا۔ اور وہ ناراض ہو جاتی۔

لیکن میں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کہ اگر اس سے میری دوستی ہو جائے تو وہ فی الفور اپنے متعلق میرے تمام خیالات سے آگاہ نہیں ہو جائیگی اس لئے اس سے محض دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔

ایک مرتبہ سوینا میری ہمشیرہ سے ملنے آئی۔ اور میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ اس کے جنونِ عشق میں اسیر ہوا تھا۔ لیکن پھر میں نے اس جنون سے مخلصی حاصل کر لی تھی۔ اب میں تیسری مرتبہ اس کا عاشق ہوا۔ اس تجدیدِ عشق کی وجہ یہ تھی۔ کہ بوبیا نے مجھے شعروں کی ایک کتاب دی تھی۔ جو سوینا کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی تھی۔ اس کتاب میں بہت سے دردناک عشقیہ اشعار کے نیچے سُرخ خطوط کھینچے ہوئے تھے۔ اور نشان کردہ اوراق کو یاد رکھنے کیلئے ان کے درمیان پھول رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یاد تھا۔ کہ والودیا نے ایک مرتبہ اپنی محبوبہ کے بٹوے کو بوسہ دیا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں کتاب کو بوسہ دینے کی کوشش کی۔ ایک شام میں اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ خیال آ گیا۔ میں نے کتاب کے ایک پھول کو اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ پھول کے مس ہونے سے کوئی دردانگیز سا اثر پیدا ہوا۔ اور میں پھر سوینا کے عشق میں اسیر ہو گیا۔ اور چند دن تک میری یہی کیفیت رہی۔

آخر کار میں تیسری مرتبہ اِس موسم سرما میں ایک نوجوان خاتون پر
عاشق ہو گیا۔ یہ خاتون والو دیا کی محبوبہ تھی۔ اور اکثر اس سے ملنے کے لیے
ہمارے مکان پر آتی تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے۔ یہ خاتون قطعاً
خوبصورت نہ تھی۔ اور اِس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔ جو
میری محبت و الفت کی محرک ہو۔ یہ خاتون ماسکو کے ایک مشہور فاضل اور
ادیب کی عورت کی لڑکی تھی۔ اس کے بال خوشنما اور گھنگریالے تھے۔ اور چہرہ صاف
شفاف تھا۔ اور وہ انگریزی فیشن کا لباس پہنتی تھی۔ ہر شخص یہی کہتا تھا۔ کہ
یہ خاتون اپنی ماں سے زیادہ ہوشیار اور عالم ہے۔ لیکن مجھے کبھی اس کی
ان صفات کے جانچنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ مجھ پر اس کی ذات اور اس کے
علم کا رعب چھایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے میں نے ایک بار کے سوا کبھی
اس سے گفتگو کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اور جو ایک بار گفتگو بھی کی۔ تو
نہایت ڈرتے ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے۔ لیکن والو دیا جس سرگرمی سے
دوسروں کی موجودگی میں بھی اس سے اظہار محبت کرتا تھا۔ اُسے دیکھتے
ہوئے مجھے بھی اُس نوجوان خاتون سے عشق ہو گیا۔ اس خیال سے کہ والودیا
یہ پسند نہیں کرے گا۔ کہ دو بھائی ایک ہی دوشیزہ کے عاشق ہوں۔
میں نے اُس سے اپنے عشق کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ اس کے برعکس مجھے اِس
خیال سے خوشی ہوئی۔ کہ ہماری محبت اتنی پاک اور بے لاث ہے کہ اگرچہ

ہماری محبوبہ ایک ہی حسینہ ہے۔ پھر بھی ہم ایک دوسرے کے دوست
رہیں گے اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے پر قربان ہو جائیں گے
لیکن والودیا میری طرح ایثارِ نفس کے لئے اتنا آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔
اس پر قاتلانہ حسن کا جادو یہاں تک چل گیا تھا۔ کہ جب یہ اعلان ہو گیا۔
کہ اس خاتون سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔ تو وہ کسی غیر مرد کو اپنی
محبوبہ کی طرف آنکھ کو اٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اور
وہ اس کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ میں اپنے جذباتِ محبت
قربان کر دینا ہی عین مسرت سمجھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ مجھے اس
خاتون کے عشق سے دست بردار ہونے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا
پڑا تھا۔ مجھے صرف ایک دفعہ اس خاتون سے گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا۔
اور گفتگو میں صرف موسیقی کے متعلق بحث ہوئی تھی۔ اس لئے میری محبت
چند دنوں کی مہمان رہ کر اگلے ہفتے غائب ہو گئی۔ اور اس محبت کو تازہ
رکھنے کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔

ہماری سوتیلی ماں

اگرچہ ابا کا ارادہ سال لو سے پہلے ماسکو آنے کا نہیں تھا۔ لیکن وہ موسم خزاں میں ہی آگئے۔ اس وقت کتوں سے شکار کھیلنے کا اچھا موقع تھا۔ چونکہ ہماری سوتیلی ماں نے ماسکو آنے کی بہت خواہش ظاہر کی۔ اور اُس نے اپنی بیماری کا اس قدر بہانہ بنایا۔ کہ ابا کو اس کی خواہش منظور کرنی پڑی۔

والودیا سنجیدہ چہرہ بنا کر اس کے قریب گیا۔ اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور کہا کہ میں آپ کی آمد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آؤ بیٹا" میں آگے بڑھا۔ اور کہا کہ اپنے دوسرے بیٹے کو بھی نہ بھولئے گا۔

پہلے پہل اوبنا دیسلنا نے سوتیلی ماں کی طرح اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ کہ گھر کے آدمی سوتیلی ماں پر غلط اور نا انصافانہ الزامات لگاتے ہیں۔ اور اس طرح اسے مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ ان حالات کی مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے بھی اُس نے انہیں دُور کرنے کی کوشش نہ کی۔ نہ کسی کو پیار اور نہ کسی کو کبھی کوئی تحفہ وغیرہ دیا۔ بلکہ اپنی غفلت اور خاموشی سے ہمارے

جذبات کو اپنے خلاف بھڑکا لیا۔ اس کی عادات ہمارے خاندان سے بالکل مختلف تھیں۔ اس وجہ سے وہ ہمیں بہت بری معلوم ہوتی۔ اس کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ کبھی وہ جلد سو کر اٹھ بیٹھتی کبھی دیر سے کبھی وہ کھانا کھانے آتی۔ اور کبھی نہ آتی۔ اگر ہمارے گھر میں کوئی مہمان نہ ہوتا۔ تو وہ نیم برہنہ ادھر اُدھر ٹہلتی۔ اور ہماری اور نوکروں کی موجودگی سے بالکل نہ شرماتی۔ پہلے تو مجھے اس کی یہ سادگی پسند آئی۔ مگر بہت جلد اس کی عزت میری نگاہوں سے اٹھ گئی۔ اور میں اس فعل کو بے غیرتی سے تعبیر کرنے لگا۔

یہ تو ظاہر تھا۔ کہ میرے ابا جوا کھیلنے کے عادی تھے۔ مگر وہ گھر میں اسکا تذکرہ نہ کیا کرتے تھے۔ جوا خانے سے وہ بہت رات گئے واپس گھر آتے۔ مگر ہماری سوتیلی ماں ان پر کچھ اور ہی شبہ کرتی۔ آخر ان کے تعلقات بھی آپس میں کشیدہ ہو گئے۔

دمتری سے میرے تعلقات

ان سردیوں میں میرے تعلقات نہ صرف دمتری سے بڑھ گئے۔ بلکہ میں ان کے تمام خاندان سے متعارف ہو گیا۔ اور مجھے اکثر وارینا سے علیحدگی میں ملنے کے موقع حاصل ہوتے رہے۔ وہ کوئی ایسی حسین تو نہیں تھی۔ پھر

بھی چاہتی تھی۔ کہ میں اس سے اظہارِ عشق کروں سادہ سچ تو یہ ہے۔ کہ میرے دل میں بھی کچھ کشش ضرور تھی۔ اس کے چہرے سے سادگی برستی تھی۔ اور میں بے دھڑک اس بات کا اظہار کر دیتا۔ کہ مجھے اس کی معیت میں بہت لطف آتا ہے۔ جب تک میری ان سے صاحب سلامت رہی میں اسے بڑی سادہ تصور کرتا رہا۔ اور یہ بھی خیال تھا۔ کہ وہ بدصورت نہیں ہے تاہم یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے اس سے محبت ہے یا نہیں۔ جب کبھی اس سے باتیں کرنے کا موقعہ ملتا تو میں دوسروں پر کچھ نہ کچھ تنقید کرتا۔ اور مجھے اس سے بہت راحت ہوتی۔

پھر میرا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اور میں اپنے آپ کو نہایت مقدس اور ارفع ہستی ظاہر کرنے لگا۔ میری حرکات سے ظاہر ہوتا۔ کہ میں بہت باریک بین اور جذباتی ہوں۔ اور میں تمام مادی چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں۔ اگر چاہوں تو وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اس بناوٹ سے بہت برا معلوم ہوتا۔ لیکن تکلفات بہت چاہنے لگا۔ صرف لہو و لعب جیسا مجھ پر بڑی سختی سے مواخذہ کرتا۔ اور چبھتے ہوئے فقروں سے مجھے دق کرتا۔

ایک دن دادیا نے مجھ سے بحث کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"دمتری بہت خود بین ہے اور مغرور ہے۔ اور جو اپنی انتہائی اپالا کی

سے اپنی تعریف و توصیف سُننے کا بہت خواہاں ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ ہر بات میں پیش پیش ہو۔ اور آنتی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس کی تعریف کرتی ہے۔ تو دل سے اُس سے محبّت کرتی ہے"

یہ سُننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا۔ کہ وادیا بہت ذہین ہے۔ اور میں نے اِس کے متعلق بہت اچھا خیال قائم کر لیا۔ لیکن جب اِن کے ہاں بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ تو اِس کی گفتگو میں وہ بات نہ پائی جاتی جس کی وجہ سے میں اِس سے محبّت کرتا تھا یعنی اس کا وہ استدلال اور موسیقیت بالکل مفقود ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے۔ کہ میرے بھائی وادویا کے ساتھ تھیٹر اور موسم کے متعلق گفتگو کرتی۔ تو وہ مجھے کس قدر بھلی معلوم ہوتی۔

اِن ہی دنوں میری اور دمتری کی دوستی شدید خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میں نے عرصہ سے اِس پر نکتہ چینی کرنا شروع کر دی تھی اور اس کے عیوب مجھ پر عیاں ہو رہے تھے۔ آغاز میں ہم نہایت گرمجوشی سے محبت کرتے ہیں۔ اور اس لئے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارا دوست نہایت مکمل آدمی ہے لیکن جونہی وہ گرمجوشی کی دُھند کم ہوتی ہے۔ دانشمندی کی کرنیں اِس کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ اور ہم اپنے جذبہ کو صحیح حالت .. دیکھتے ہیں۔ تو ہم پر اس کے نقص غیر متوقع طور پر عیاں ہو کر سامنے

ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے سرد مہری سے پیش آتے ہیں۔ اور نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ آخر ہم اس سے علیحدہ ہو کر کسی حقیقی دوست کی تلاش کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ پہلے ہماری دوستی بہت مستحکم تھی اس لئے میں اس کے عیوب نہ دیکھ سکا لیکن اب اس سے متنفر ہو گیا اور ہم اپنی گفتگو میں ان تیروں اور نشتروں سے کام لینے لگے جو ہم خود ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے چکے تھے۔

نئے ساتھی

امتحان کی فہرست چسپاں کر دی گئی تھی۔ اس وقت مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ سولہ مضامین میں میرا امتحان ہو گا۔ میں ان مضامین کے لیکچروں میں کبھی حاضر نہیں رہا۔ اور نہ ہی میں نے ان کے متعلق کبھی نوٹ لئے تھے۔ حیرت ہے۔ کہ مجھے کبھی خیال پیدا نہ ہو سکا۔ کہ میں امتحان میں کیونکر کامیاب ہوں گا۔ اس لیکچروں کو اس لئے جا کر سنتا۔ کہ یہ میری عادت بن گئی تھی۔ اور ابا مجھے گھر سے باہر بھیج دیتے تھے اسکے علاوہ میرے بہت سے دوست بن گئے تھے۔ اور میں بیٹھا گپیں ہانکا کرتا مجھے ہنسنا کھیلنا بہت بھاتا۔ میں آخری بنچ پر بیٹھنا پسند کرتا

اور جب موقعہ ملتا۔ چپکے سے کمرے کے باہر نکل جاتا۔

لڑکے امتحان کی تیاری کے لئے نہایت انہماک سے آپس میں مل جل کر پڑھنے لگے۔ میں بھی دو تین لڑکوں سے جا ملا۔ کہ اکٹھے پڑھا کریں گے۔ جب ہم اکٹھے ہوئے۔ اور وہ اپنے سبق کے متعلق ایک دوسرے سے سوالات کرتے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔ میں نے ایک مہمل سا سوال کیا۔ اس پر سب نے مجھے جھاڑنا شروع کر دیا۔

مجھے اس سے بہت شرم آئی۔ پندرہ دن تک میں ان کے ساتھ پڑھتا رہا۔ مگر میں نے کچھ بھی اخذ نہ کیا۔ وہاں بیٹھا میں یہی ظاہر کرتا رہا۔ کہ میں غور سے سن رہا ہوں۔ اور سب کچھ سمجھتا ہوں۔

ایک اُن میں ڈینگ مارنے والا تھا۔ کہ ادب میں مجھے بہت درک حاصل ہے۔ خصوصاً فرانسیسی علم ادب میں اور میں نے اس کے متعلق گفتگو شروع کی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کہ اگرچہ ان کا تلفظ اچھا نہ تھا۔ مگر ان کا مطالعہ بہت زیادہ تھا اور انہیں میں نے اِن مصنفوں کی تعریفیں کرتے سُنا جنکے نام بھی میں نے نہیں سُنے تھے۔ اور ادب کو وہ مجھ سے بہتر طریقہ

پر سمجھتے نہ تھے۔اس کا مجھے بھی اعتراف ہو گیا۔اس کے علاوہ انہیں علم موسیقی میں بھی کافی دسترس تھی۔اور آپس میں ان کے دوستانہ تعلقات بہت اچھے تھے۔

زوخن

میں یہ تو نہیں جانتا۔کہ زوخن کسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں۔کہ وہ ایس۔ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کی آمدنی کے کوئی ذرائع نہ تھے۔جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ شرفا کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

اگرچہ دیکھنے میں زیادہ عمر کا معلوم ہوتا۔ وہ بہت ہوشیار خاص طور پر تیز فہم تھا۔ وہ بڑی آسانی سے پیچیدہ سوالات کو سلجھا لیتا۔اور اس تکبر کے باوجود اس کی خصلتیں نیک اور دوسروں سے تعلقات بہت اچھے تھے۔اس نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا بھالا تھا۔اُسے عشق و محبت۔ روپیہ۔ پیسہ۔ اور کاروبار کا تجربہ حاصل تھا۔اس کی قابلیت کا یہ عالم تھا۔کہ وہ

بغیر نوٹ لئے ریاضی کے سوال نہایت عمدہ طرح سے حل کر لیتا تھا۔
وہ پروفیسروں کا قافیہ تنگ کرتا۔ مگر موقع پر اپنے آپ کو اُن کے
ڈھب کا بنا لیتا۔ اس لئے سب پروفیسر اس کو پسند کرتے
وہ بہت صاف گو تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ پروفیسر اس کی عزّت
کرتے رہے۔ مطالعہ میں اسے بہت کم وقت صرف کرنا پڑتا تھا
اس کی تیز اور ہوشیار طبیعت کسی اور چیز کی متلاشی رہتی۔
جسے وہ زندگی کے نام سے موسوم کرتا۔ امتحان سے دو ہفتے
پہلے زوخن غائب ہو گیا۔ اور وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اسی دن دکھائی
دیا۔ جس دن کہ امتحان تھا۔ اس وقت اُس کے ہاتھ کانپ رہے
تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اِس پژمردگی کے باوجود
اُس نے نہایت کامیابی سے امتحان پاس کیا۔

میں فیل ہو گیا

آخر امتحان کا دن آ پہنچا۔ پہلے ہی روز ریاضی کا امتحان تھا
میری طبیعت عجیب کشمکش میں تھی۔ اور جو کچھ پیش آنے والا تھا
اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ اور طبیعت کی اس غیر مُعیّن حالت

میں امتحان میں شریک ہونے کے لیے جا پہنچا۔

میں اس بنچ پر جا بیٹھا۔ جہاں شہزادے اور امراء کے لڑکے بیٹھے تھے۔ اور ان سے فرانسیسی زبان میں گفتگو کرنے لگا میں نے اِس امر کو فراموش کر دیا۔ کہ مجھے ابھی اِن مضامین کا امتحان دینا ہے۔ جن کے متعلق میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ جو لڑکے امتحان دینے کے لئے پڑھتے۔ ان کو نہایت سرد مہری سے دیکھتا۔ اور بعض کا مذاق اُڑاتا۔

الینکا بولا۔ ہم بھی دیکھیں گے۔ تم کونسا تیر مار لو گے۔ جب سے ہم کالج میں داخل ہوئے تھے۔ اُس نے میرے خلاف بغاوت کر رکھی تھی۔ جب میں اِس سے بات چیت کرتا۔ تو وہ بالکل نہ مسکراتا۔ اور مجھ سے ہمیشہ متنفر رہتا۔

میں الینکا کے جواب پر نہایت حقارت سے ہنسا۔ اگرچہ جس شبہ کا اِس نے اظہار کیا تھا۔ اس نے مجھے ایک لمحہ کے لئے چونکا ضرور دیا۔ آخر دُھندسی میرے خیالات پر پھر چھا گئی۔ اور میں پھر اِسی طرح سے بے پروا ہو گیا۔ جب مجھے الینکا کے ساتھ امتحان کیلئے بلایا گیا۔ تو میں اپنے قمیض وغیرہ کو دُرست کرتا ہوا خاموشی سے ممتحن کی میز کے پاس جا کھڑا ہوا۔

ممتحن نے جب میری طرف دیکھا۔ تو میرے جسم پر خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔ الینکا پر جو سوال کیا گیا۔ اُس نے اس کا جواب نہایت غلط دیا۔ مگر جب میری باری آئی۔ تو بالکل خاموش کھڑا رہا ممتحن نے مترحم نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

تمہیں دوسری جماعت میں ترقی نہیں دی جائے گی۔ تمہارے لئے تو بہتر تھا۔ کہ امتحان میں شریک ہی نہ ہوتے۔ پھر ایکونین سے کہا تم بھی پاس نہیں ہو سکتے۔

ایکونین نے دوسری دفعہ امتحان میں شریک ہونے کی اِس طرح اجازت مانگی۔ گویا وہ خیرات مانگ رہا ہے۔ مگر پروفیسر نے جواب دیا۔ جو کچھ تم سال بھر میں تیار نہیں کر سکے۔ وہ دو دن میں کیونکر تیار ہو سکتا ہے۔ تم یقیناً پاس نہیں ہو سکتے۔ ایکونین نے پھر گڑگڑا کر استدعا کی۔ مگر پروفیسر نے اسے بھی رد کر دیا۔

اس نے پھر آہستہ سے کہا "صاحبان تشریف لے جائیے۔

میں میز سے ہٹ گیا۔ اور اس قدر شرمندہ ہُوا۔ اور مجھے معلوم نہیں۔ کہ کمرے سے لڑکوں کے سامنے کیونکر باہر نکلا۔ اور

ان کے سوالوں کا کیا جواب دیا۔ اور گھر کیونکر پہنچا۔ میں بہت غمزدہ ہو گیا تھا۔ اور واقعی سخت بدبخت تھا۔

تین دن تک کمرے سے باہر نہ نکلا۔ اور کسی سے نہ ملا۔ بچوں کی طرح میں نے رونے میں تسکین پائی۔ میں اپنی خودکشی کے لئے پستول تلاش کرتا۔ میں خیال کرتا کہ اینگا گریپ جب مجھ سے ملے گا تو میرے منہ پر تھوکے گا۔ اور اس پر حق بجانب بھی تھا۔ وہ میری ناکامی پر خوش تھا اور ہر ایک سے اس کا تذکرہ کرتا تھا۔ میں اپنی اس بدبختی کا ذمہ دار کسی اور کو قرار دیتا۔ اور سمجھتا۔ کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ اور میرے خلاف منظم سازش کی گئی ہے پروفیسروں، اپنے ساتھیوں والو دیا، ومتری اور ابا کو کوستا۔ کہ انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں کیوں بھیجا۔ اس خدا کو برا بھلا کہتا۔ جس نے مجھے یہ بے عزتی برداشت کرنے کو زندہ رکھا آخر جب میں نے دیکھا۔ کہ میں ان سب لوگوں کی نظروں سے گر گیا۔ جو مجھے جانتے تھے۔ تو میں نے ابا سے التجا کی کہ مجھے کسی دوسری جگہ بھیج دیجئے۔ اگرچہ وہ مجھ سے مطمئن نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے میرے شدید غم کو ملحوظ رکھتے ہوئے تسلی دی۔ اور کہا۔ کہ مضامین تبدیل کر لو۔ والودیا نے بھی بتایا۔ کہ اس طرح سے

ہم جماعتوں میں شرمندگی نہ ہو گی ۔

ہماری مستورات نہ سمجھتی تھیں ۔ اور نہ ہی سمجھنا چاہتی تھیں ۔ کہ امتحان کا مطلب کیا ہے ۔ اور امتحان میں کامیاب ہونا کسے کہتے ہیں وہ مجھ پر اس وجہ سے ترس کھاتی تھیں ۔ کہ میں نہایت غمگین رہتا تھا ۔ ماسٹری اس سے پہلے میرے ہاں آتا ۔ اور تپاک سے پیش آتا ۔ مگر اب مجھے معلوم ہو گیا ۔ کہ وہ سرد مہری سے کام لیتا ہے وہ میرے پاس آتا ۔ اور اس طرح خاموشی سے آ کر بیٹھ جاتا ۔ جیسے ایک ڈاکٹر نہایت خطرناک مریض کے پاس بیٹھا رہتا ہے تین دن کے بعد میری حالت کچھ بحال ہوئی ۔ میں اچانک کسی خیال سے اچھل پڑا ۔ اور سیڑھیوں پر چڑھ گیا ۔ اوپر جا کر میں نے اپنی وہ نوٹ بک نکالی ۔ جس پر "زندگی کے اصول" لکھا تھا ۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی حالت پر افسوس کرتا ۔ اور روتا رہا ۔ اس کے بعد میں دوبارہ زندگی کے اصول لکھنے پر آمادہ ہوا اور مصمم ارادہ کر لیا ۔ کہ آئندہ کوئی بُری حرکت نہ کروں گا ۔ اور ایک لمحہ بھی غفلت میں نہیں گذاروں گا ۔

یہ اخلاقی اثر کب تک باقی رہا ۔ اور اس نے میرے لئے کونسی نئی نئی بنیادیں استوار کیں ۔ اس کا ذکر جوانی کے باقی ماندہ

نصف حصّہ میں کروں گا۔

ٹالسٹائی اِس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا باقی حِصّہ اُس نے شایع نہیں کیا۔

کاؤنٹ ٹالسٹائی کی دیگر تصانیف

عورت مرد کے تعلقات جو لوگ فحش لٹریچر پڑھ کر اپنی صحت کھو بیٹھے ہیں یا جو عورت مرد کے صحیح تعلقات سے ناآشنا ہیں اُن کے لئے یہ مشعل ہدایت کا کام دے گی۔ قیمت مجلد ۸ر

راجا پرجا:۔ اس میں زمین۔ مزدوری سلگان۔ زمین جائداد کے قوانین غلامی کی وجوہات سیاسیات پر پُرمعنی کتاب ہے۔ قیمت ۱۲ ار

غلامی کا انسداد:۔ غلامی کسے کہتے ہیں۔ اور کیونکر دُور کی جا سکتی ہے۔ قیمت ۱۲ ار

ٹالسٹائی کے افسانے:۔ روس کے مایہ ناز ادیب اور معاشرتی اصلاح کے علمبردار کے سوشل افسانے۔ قیمت مجلد عہ

لاجپت رائے اینڈ سنز

پبلشرز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور